

تو۔ اس وقت وہ بغیر وجہ اپنے مانگوں سے لڑنے کی شدت سے کوشش کرتی مگر اس کے مانگوں نہ جانے کسی مٹی سے بننے ہوئے تھے۔ جواب میں سر جھکائے کراس کے روپ و کھڑے ہو جاتے۔ ”لیں میڈم ساری میڈم۔“ اس بات پر میڈم کو اور غصہ آتا اور آنکھیں دکھاتی منہ بناتی اور فرفرا انگریزی بولتی جسے سن کر ان کے رہے ہے اوسان بھی خطا ہو جاتے اس پر مسز فلپ مایوس ہو کر مرے میں جا کر رو دیتی رونے سے دل کی بھڑاس نہ لکتی تو مسز فلپ کو ایک لمبا خط لکھنا شروع کر دیتی۔

مسز فلپ کے دفتر والے سمجھتے تھے کہ میڈم کی بات سمجھو گئیں نہیں آتی کبھی ہستی ہے نہے جاتی ہے کبھی بغیر وجہ اگر جنا شروع کرو دیتی ہے۔ خواہ گنوہ اب بھتی ہے۔ منہ کو آتی ہے اور پھر بیٹھ کر آنسو بیان نہ لکتی ہے۔ نہ جانے کیسی افسر ہے گھری میں کچھ، گھری میں کچھا بھی معطل کرنیکی دھمکی دے رہی تھی اب چپڑا سی کے ہاتھ بادام بھیج دیئے کہ پشاور سے آئے ہیں تم بھی کھالو۔

” محمود نے جب آسامیوں کا اشتہار دیکھا تو تفریح کا ایک عرضی دیدی تھی۔ اس وقت اسی عالم نے تھا کہ پتلغییر کے محلہ میں زیادہ تر کارکن عورتیں اور محلہ کا چیف بھی عورت ہے۔ عورتوں کے متعلق محمود کا روایہ عجیب تھا۔ اگر چوہہ قسم کا فرد نہ تھا پھر بھی اسے عورتوں سے بے حد دل چسپی تھی۔ ایسی دل چسپی جو ایک ناٹل م رد عورت سے محسوس کرتا۔ لیکن ساتھ ہی اسے عورت سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ان سے گھبرا تا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی شدید کوشش کرتا۔ یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ توجہ جذب کرنیکی کو ششل کر رہا ہے یا انہیں غیر از معمول اہمیت دے رہا ہے بلکہ اس کے عکس وہ بے پرواں کا لبادہ اوڑھے رکھتا اور ما تھے پر یوں تیوری جمالیتا جیسے نسوانی سحر سے مستثنے ہو۔ پھر موقعہ ملنے پر ایک شدت بھی نگاہ ڈالتا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا گلیڈ آئی چمکاتا اور پھر تیوری چڑھا کر یوں منہ موڑ لیتا۔ جیسے جانتا ہی

جب وہ نیا نیا اس محلے میں گیا تو عورتیں ہی عورتیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن اس گھبراہٹ کے ساتھ ہی دل چپسی بھی محسوس کی۔ بہر حال اس نوکری میں سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ اسے محکم چیف۔ یعنی میڈم سے کم کرنا پڑتا تھا۔ میڈم کو دیکھتے ہی محمود نے تیوری چڑھائی اور یوں کام میں محو ہو گیا۔ جیسے اسے عورت اور مرد کی تمیز ہی نہ ہو۔ لیکن ولیفیر کی کئی ایک کارکن بڑی باگھی تھیں۔ کئی ایک شوخ تھیں۔ ایسے حالات میں بھلاہر وقت پیشائی پر تیوری چڑھائے رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ لہذا اجنب میڈم کی توجہ ادھر ہوئی تو وہ کارکن پر آنکھ چپکاتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

آنکھ چپکا کر دفتار پھر سے پھر ہو جانے کے لئے میں محمود ک جواب نہیں تھا۔ لیکن وقت یہ تھی۔ کارکنیں بالکل ہی نوجوان تھیں۔ وہ اس کی نگاہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ پکھل کر موم ہو جاتیں اور موم سے چینٹے اڑتے اور میڈم پر جا پڑتے۔ اس پر میڈم کو غصہ آ جاتا۔

میڈم کو اس بات پر غصہ آتا کہ ابھی یہ لڑکی مناسب طریقے سے باقیں کر رہی تھی اب منہ بنانے لگی لفظوں کو رولنے لگی۔ آنکھیں چپکانے لگی۔ رکنے لگی۔ گال تمنا گئے یہ کیا گڑ بڑھے۔ وہ یہ سمجھنے لگی کہ لڑکیاں محمود کے روپر و آ کر دھک جاتی ہیں۔ اسے پہنچنے تھا کہ محمود اپنے ماتھے کی شکن آتا سکتا ہے۔ دو ایک بار میڈم نے اعلان یہ محمود سے اس تبدیلی کی بات کر دی جو اس کی موجودگی میں لڑکیوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس پر محمود گھبرا گیا اور اسے غصہ آ گیا اور اس کا روپ یہ میڈم سے اور بھی سخت ہو گیا۔

ایک روز جب میڈم نے کہا۔ ”تم نے دیکھا گلرک جب اس لڑکی نے تمہیں دیکھا تو اس کے ہاتھ میں پن شیک کرنے لگا۔ حتیٰ کہ خط بدل گیا۔“

میڈم کی ایسی بات پر محمود کو غصہ آتا تھا۔ تو پھر تمہیں کیا۔ وہ دل میں کہا کرتا۔ اس

روز تو اسے بہت غصہ آیا۔

وہ بھی غصے سے بھرا بیٹھا تھا کہ مالی پھول لے آیا۔ میڈم نے پھول دیکھ کر گویا خوشی سے چیخ ماری۔ ”یہ دیکھا تم نے کفر ک۔“ وہ چلائی۔ ”کتنے خوبصورت پھول ہیں یہ دیکھتو۔“

محمود نے منہ موڑ لیا۔ ”نہیں میں نہیں دیکھتا۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

میڈم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کسی ماتحت نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید اسے غلطی ہو۔ شاید کفر ک نے غلطی سے بات کروئی ہو۔ یہ کیسے ہے کہ ایک ادنی ماتحت مجھ سے لڑنے کی کوشش کرے۔ ”تمہیں دیکھنا پڑے گا۔“ وہ شدید جوش میں بوی۔

”یہ میرے فرائض میں سے نہیں ہے۔“ محمود نے گھور کر میڈم کی طرف دیکھا۔ میڈم کامنہ سرخ ہو گیا۔ شاید خوشی سے پھر وہ غصے میں چلانے لگی۔ یا شاید رائی کے اس نئے امکان پر خوشی سے چیخ رہی ہو۔

”یہ کوئی بات کرنے کا طریقہ نہیں ہے کفر ک۔“ وہ بوی۔

”میڈم یاد رکھئے کہ میرا نام کفر نہیں محمود ہے۔“ محمود نے کہا اور پھر خراماں خراماں چل پڑا۔ جیسے شاہ کا پارٹ اوکرنے کے بعد ایکسریٹرے رجسٹریٹری سے ٹیکھ سے باہر چلا جاتا ہے۔ میڈم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اگلے روز جب محمود ففتر آیا تو وہ جان بو جھ کرانے کرے میں جا بیٹھا۔ ورنہ عام طور پر اس کا مستور تھا کہ آتے ہی پہلے میڈم سے ملتا کام کا ج متعلق پوچھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

کچھ دیر کے بعد مالی آتا۔ میم صاحب بلا تی ہیں۔“

”اچھا محمود نے کہا۔ کام سے فرصت ہو گی تو آؤں گا۔“

مالی کو گئے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ میدم خود آگئی۔ وہ بولی۔ ”مجھے پھول نہیں دکھانے۔

بلکہ خط کا جواب لکھوانا ہے۔“

”ہوں۔“ محمود نے سر پہاڑیا اور اپنی سیٹ پر جیٹھا رہا۔

اس روز میدم بے حد خوش تھی وہ بار بار محمود کے گمراہے میں آتی اور اسے کوئی نہ کوئی بات سمجھا کرنا یا بتا کر چلی جاتی اور کچھ دیر کے بعد دوڑ آتی۔ محمود کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا روایہ کیوں بدلا جاوے ہے۔ اس نے ٹلک کی جگہ مسٹر محمود کہہ کر اسے پکارنا کیوں شروع کرو یا ہے۔

شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ میدم اس کی امداد کے بغیر کام نہیں چلا سکتی تھی۔ چونکہ ففتر کے دوسرا ٹلک قابلیت اور ذہانت سے خالی تھے اور روزمرہ کے معمولی کام کے علاوہ کچھ کرنے کی امیلت نہیں رکھتے تھے۔ محمود کو اپنی قابلیت پر اعتماد تھا اور یہ اعتماد مزید مشکلات کا باعث تھا۔

ایک روز میدم محمود کا لکھا ہو خط پڑھ کر بولی۔ ”ٹھیک ہے لیکن متاثر کے لفظ کے چیز ٹھیک کرلو۔“

”ہوں۔“ محمود بولا اور اس نے میدم کے سامنے وہ خط لفافے میں بند کر کے ڈسپچر کو دے دیا۔ ”اسے ابھی ڈسپچ کر دو۔ وہ بولا۔“

”لیکن میں کہہ رہی تھی متاثر کے چیز ٹھیک کر کے بھیجو۔“

محمود بڑے اطمینان سے خط کی نقل اٹھائی پھر آس فور ڈاکشنری لیکر وہ نقل اور ڈاکشنری میدم کی طرف بڑھا دی۔

اس بات پر میدم تیخ پا ہو گئی۔ میں نے کہا تھا کہ تم ہجے دیکھ لو۔“

”میں تو وثوق سے جانتا ہوں کہ ہجے ٹھیک ہیں۔ محمود بولا میدم اپنی آسلی کر لیں۔“

محمود نے اس کے اس قسم کی طرز عمل سے میدم چوکی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ

ایک مرد سے بات کر رہی ہے فلک سے نہیں۔ غالباً اسے اپنا خاوند یاد آ جاتا اور پھر شاید اس خیال پر کہ فلک کو مردوں کا سامنہ تو کرنے کا حق ہے یا شاید اس لئے کہ اس کا خاوند اتنی دور کیوں رہتا ہے وہ غصے سے بھوت بن جاتی۔ بہر صورت میڈم اور محمود کے درمیان عجیب چیقلش شروع ہو گئی۔ غالباً محمود کی خواہش تھی کہ کسی وجہ سے میڈم ناراض ہو کر اے واپس آپنے ملکے میں بھیج دے۔ اس لئے اس نے جان بو جھ کر میڈم کی باتوں کو روکنا شروع کر دیا اسے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ ایسی باتیں کر کے وہ میڈم کو احساس ولارہا ہے کہ وہ فلک نہیں مرد ہے اور میڈم چیف کے علاوہ عورت بھی ہے۔

اس کے بعد محمود نے مسز فلپ کے بھی معاملات میں دل دینا شروع کر دیا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کے معاملات میں دل چھپی لے اس سے جھگڑے مشورے دےتا کہ اسے ایک ساتھی کی موجودگی کا احساس ہو۔

اگرچہ مسز فلپ تنخواہ ملتے ہی ایک معقول رقم مسز فلپ کو بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن جلد ہی فلپ کی زیادتی کا تذکرہ ہوتا اور عام ضروریات مثلاً سگریٹ و سکی کافی کی کمی کی شکایت ہوتی۔ مسز فلپ پھر کچھ روپیہ بھیج دیتی۔ لیکن جلد ہی پھر ایسا ہی خط موصول ہوتا۔ پھر روپیہ بھیجنے کے علاوہ صبح شام مسز فلپ کی پریشانیوں کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس نے کبھی ان مطالبات کا برانہ مانا تھا۔ بلکہ اکثر وہ اس قدر روپیہ ارسال کر دیتی کہ خود اپنی ضروریات میں تخفیف کرنی پڑتی اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسے خود کھانے پینے کے لئے قرض لیا پڑتا تھا۔

ستر ہواں لے پالک

ایک روز جب ہومسٹر لے پالک کو دوسری قطع ارسال کر رہی تھی تو محمود نے کہا۔ ”میڈم یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ نقدر روپیہ بھیج دیتی ہیں اور مسز فلپ اسے ادھر ادھر خرچ کر دیتے ہیں اور سگرٹ اس کی تمام ضروریات ویسی کی ویسی پوری

ہوئے بغیر رہ جاتی ہیں۔“

”تو میں کیا کروں۔“ میڈم چلائی۔

سیدھی بات ہے۔“ محمود بالا۔ روپیہ کی جگہ سگرٹ وسکی چائے کافی وغیرہ بھیجے تاکہ ضروریات پوری ہو جائیں۔

”سچ۔“ وہ چلائی اور بچوں کی طرح خوشی سے تالیاں پیلنے لگی۔ یہ بات تو مجھے سوچھی ہی نہیں۔“

”چھپن تو صحارا ہوں یہ وہ بنسا۔“

”سچ۔“ وہ بچیدگی سے نبولی تمہارے بغیر۔ وہ دفتر کا گئی۔ اس روز غالباً پہلی مرتبہ واضح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے اس نے خود کو روکلیا۔ محمود پھر بھی بات کو پانہ سکا اور مسز فلپ اس حقیقت کو واضح طور پر پانے کے بعد شدت سے اسے نظر انداز کرنے اور بھول جانے کی کوشش میں کھو گئی۔ جب ایلی ایگے ساتھ نیا شہر پہنچا تو ان دونوں کی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ وہ پانہ سکا وہ پاچکی تھی۔ لیکن نظر انداز کرنے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھی اور هر مسٹر فلپ نقدر روپیہ کی جگہ اشیا کی بیٹھی موصول کر کے جیران رہ گیا تھا۔ ایسی بات تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی پیاری بیوی تو ہمیشہ اسے نقدر روپیہ بھیجا کرتی تھی اور منی آرڈر سے نہیں بلکہ تارکے ذریعے اور آج غیر از معمول سگرٹ کے ٹیوں اور وسکی کی بوتکوں کی بیٹھی اس کے روپ پڑی تھی۔ خیر اشیا تو کچھ بری نہ تھیں لیکن وہ اس افراط سے بھیجی گئی تھی کہ مہینہ بھر مطالبہ کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اور نقدر روپیہ موصول کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔

یہ دیکھ کر وہ چڑھ گیا۔ نہ جانے میری بیوی کو کون ایسے گر بتا رہا ہے۔ ورنہ وہ تو صرف محسوں کرنا جانتی ہے۔ سو چنانہیں۔

مسٹر فلپ نے اس بھید کو جاننے کے لئے اپنے ذرائع استعمال کرنے شروع کر دیئے اور غالباً گھر کے کسی نوکر نے مسٹر فلپ کو صورت حالات سے واقف کر دیا۔

ایلی کے نیا شہر پہنچنے پر میڈم کو یاد آیا کہ ویفیسٹر کے طالب علموں کے پرچے جو اس کے پاس دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے _____ انہیں چیک کر کے واپس کرنے کی تاریخ سر پر آج پہنچی تھی۔ اس نے اس نے محمود کو بلا بیا اور اس نئی مشکل کا تذکرہ کیا۔

محمود نے کہا۔ میڈم اس میں کیا مشکل ہے۔ اگر ہم چارٹھس بیٹھ جائیں تو ایک رات میں بارہ سوپر پر چھتے ختم کر دیں گے۔ میں ہوں ایلی جسے۔ آپ ہیں اس کے علاوہ آپ کی قیمتی ناظمہ ہے۔

میڈم کو یہ تجویز پیندا آئی اور ایک رات وہ چارلوں میڈم کو تھی کے بڑے کمرے میں بیٹھ گئے تاکہ پہچان دیکھ لیں۔ سوپر پر ایک نیکی و اپنی بھروسے ایں اور اس اہم غرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

ادھر مسٹر فلپ کو جب معلوم ہوا کہ میڈم کا ایک ٹکر اسے ایسے ویسے مشورے دے رہا ہے تو اس نے سوچا کہ اس مصیبت کو کسی طرح شروع شروع میں ہی ٹالنا چاہیے ورنہ اگر مسٹر فلپ اسی راستے پر چل نکلی۔ تو پھر اس کا زاویہ نگاہ بدلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے صورت حالات کو جانچنے کے لئے اس نے آٹھ یوم کی رخصت لی۔ اور اطلاع دیئے بغیر نئے شہر آگیا۔ دن بھر وہ سٹیشن پروینگ روم میں بیٹھا رہا۔ جب رات پڑی تو چھپ کر گھر آیا۔ آکر اس نوکر سے ملا جس نے اطلاع بھیم پہنچائی تھی۔ نوکر نہ سوچتا۔ صاحب وہ تو اس وقت بھی اندر کمرے میں بیٹھے ہیں۔ دو مرد ہیں ایک عورت ہے اور میڈم ہے۔

یہ سن کر مسٹر فلپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سب نوکروں کو اکٹھا کیا۔ ایک پلان مرتب کیا۔ جس کے مطابق ایک نوکر نے بھلی کامیں سونچ بند کر دیا اور باقی سب نے اس کمرے پر یافگار بول دی جس میں ایلی محمود میڈم اور ناظمہ پرچے دیکھنے میں مصروف تھے۔

بکلی بند ہوتے ہی کمرے میں ایک ہنگامہ مج گیا۔ محمود نے ایک چٹکھاڑی ماری۔ میڈم چلانے لگی۔ ناظمہ جیخ رہی تھی۔ ایسی حیران تھا کہ ما جرا کیا ہے ایک جو تا اس کے سر پر پڑا۔ اسے وہ اٹھ بیٹھا۔

کمرے میں سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ڈر گیا۔

کمرے کی ایک کھڑکی مکمل کھلی تھی۔ محمود نے باہر چھلانگ لگادی اور پھر چینے لگا۔ ایسی ایسی۔

محمود کی آوازن کراپلیں کا دل بیٹھا کیا اس نے خطرے کو شدت سے محوس کیا اور وہ کھڑکی کی طرف بجا گا۔ اس وقت رات کے دوالبیج تھے۔ محمود اور ایسی چپ چاپ ویران گلی میں دوسرے تھے۔
”لیکن بات کیا تھی۔ ایسی پوچھ رہا تھا۔“

”خاموش۔“ محمود کا روپیہ اسے اور بھی ڈرارہتا تھا۔

”اپنے مکان کے قریب پہنچ کر محمود رک گیا۔ بولا۔ گھر جانے میں خطرہ ہے۔“

”لیکن کیوں۔“ ایسی نے پوچھا۔

”شاپید وہ پولیس لے کر ہمارے گھر آئیں۔“

”لیکن کون۔“ ایسی نے پوچھا۔

”وہ تھے کون؟“ ایسی نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ لیکن مجھے خطرے کی بوآتی ہے۔ دشمن وار کرنے سے نہیں چوکے گا۔“

”تو پھر۔“ ایسی نے پوچھا۔

”ہمیں گھر نہیں جانا چاہیے۔“

”لیکن اس وقت گلیوں میں آوار گردی کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ چلایا۔ چوریلوے شیشل کے مسافر خانے میں جائیجیں۔“
صح سویرے ہی محمود نے ایلی کو کہنی ماری۔ ”اب دن چڑھنے کو ہے۔“ وہ بولا۔
اب یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“

”تو پھر جائیں کہاں۔“
”بآہر دوڑ کسی ویرانے میں۔“ محمود بولا۔ جب تک ہمیں صورت حال کا علم نہ
ہو ہمارا پایا جاتا ٹھیک نہیں۔“ وہ دونوں نیا شہر کی مشہور ندی کرن کی طرف چل پڑے
اور ٹیلوں میں جا چھپے۔

اول ہر میدم کو جب معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس لئے کی تھی اور اسے شک
تھا کہ میدم اور محمود کے درمیان ناجائز تعلقات پیش تو وہ ضد میں آگئی اور ایک جملے
سے اس نے اپنے شوہر کو خاموش کر دیا تا جائز تعلقات کو جائز بھی بنایا جا سکتا ہے۔
مرٹر فلپ مجھے روکنے والے تم کون ہو۔“

پھر مرٹر فلپ اسکے قدموں میں گر کر رورہا تھا۔ اظہار محبت کر رہا تھا اور میدم
یوں پتھر بنی بیٹھی تھی جیسے وہ ماں جو _____ اپنا اکتوتا پیٹا سپردخاک کرنے کے
بعد قبرستان سے لوٹی ہو۔ غالباً وہ اپنے ستر ہواں لے پالک کے متعلق سوچ رہی تھی
اور اس کا ستر ہواں لے پالک اس موہوم خطرے سے بے خبر سہا ہوا بیٹھا تھا۔

پہلی ٹھوکر

ایلی واپس جاورا پہنچا تو سکول پر سکوت طاری تھا اسامدہ اوس تھے اور ایلی کے
ساتھی گھنٹوں میں سردیئے بیٹھے تھے۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ مسعود اور وہ خود
تبديل کر دیئے ہیں اور جاورا کے تمام اسامدہ کووارنگ کا ایک خط موصول ہوا ہے۔
جس میں مرٹر معروف نے اعلان کیا ہے کہ اگر جاورا اسکول میں مزید کسی قسم کی گڑڑ
ہوئی تو زیر دست ایکشن لیا جائے گا۔

جب وہ گھر پہنچا تو افضل خاموش بیٹھا تھا۔ ”تم آگئے۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”کہاں رہے اتنے دن۔“

”پھنس گیا۔“

”ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھا حسب عادت پاؤں پلاٹا رہا۔

”ایلی۔“ وہ بولتا۔

”جی۔“

”تمہیں معلوم ہوا۔“

”کیا؟“

”تمہاری تبدیلی ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔“

”تو تم جاوے گے؟“

”جانا ہی پڑے گا۔“

”ہوں _____ تم چلے جاوے گے تو میں کیا کروں گا۔ افضل کی آواز کانپ رہی

تھی۔

”اگر ہمیں معلوم ہوتا۔“ شبیر بولا۔ تو یہ کام ہی نہ کرتے۔

”پتہ ہے۔“ احمد نے کہا ”شیخ کی ترقی رک گئی ہے۔“

”اس سے ہمیں کیا فائدہ۔“ افضل نے کہا۔ ”پتہ ہے مولوی کا کیا حشر ہوا۔“

”کیا؟“ شبیر نے پوچھا۔

”پاگل خانے میں ہے۔“

کیا واقعی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”سچ۔ ایک آدمی خود مل کر آیا ہے اسے ہوش کھو بیٹھا ہے۔ ہماری محنت بالکل

اکارت گئی۔ نہ مولوی کو بچا سکے نہ شیخ کو توڑ سکے پتہ ہے مسر معروف نے کیا کہا تھا۔“

شیئر نے پوچھا۔
”کب۔“

”تمہارے جانے کے بعد ایک دن پھر آئے تھے۔“ شیئر بولا۔ ”سب اساتذہ کو اکٹھا کر کے وعظ فرمایا تھا۔“
”کیا کہا تھا۔“
”کہنے لگے۔ سب ہیڈ ماسٹر ایسے ہی ملیں گے۔ تم خود ہیڈ ماسٹر بنو گے تو ایسے ہی ہو جاؤ گے۔“
”جی کہتا ہے۔“ افضل بولا۔
”اللہ پچانے۔“ یائی نے کہا۔
اور وہ سب گھری سوچ میں پڑ گئے۔
دروازہ بجا تو وہ چونکے۔

”میں اندر آ سکتا ہوں۔“ کسی نے باہر سے پکارا۔
”آ جاؤ میں۔“ افضل بولا۔ ”یہاں۔“
کسی نے نووارو کی طرف ندیکھا۔
”یہ شیخ مسعود ہے احرامی ہے۔“ افضل بولا۔ اس کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکے۔
”یہ تو غلط ہے۔“ نووارو نے کہا۔
”انہوں نے نووارو کی طرف دیکھا۔ سامنے خود شیخ مسعود کھڑا مسکرا رہا تھا۔“
”تم نے میری وہ پٹائی کی ہے۔“ وہ قیقهہ مار کر ہنسا۔ ”جو آج تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ میں تمہاری عظمت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔“
”نہیں شیخ صاحب۔“ افضل نے کہا۔ ”جو تم نے مولوی کیسا تھا کیا ہم اس کا انتقام نہیں لے سکے۔“
”اچھا تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا یا اللہ آخر آ صفحی کا

میرے خلاف ہو جانا کس وجہ سے ہے میں نے آج آ صفحی کے خلاف کچھ نہیں کیا اتنا مجھے آ صفحی سے اک لگاؤ سا ہے۔ کیوں آ صفحی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے۔ ”سچ ہے۔“ ایں بولا۔

”ہاں۔“ شیخ نے سر جھکایا۔ ”مولوی سندھاں میں زیادتی ہو گئی۔“

”بہر حال میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح جدا ہوں۔“ اس نے ہاتھ پڑھایا۔

آج سے تم میرے دوست ہو۔ ہمیشہ ہی تھے۔ میرے دل میں تمہارے خلاف غصہ بہت تھا۔ لیکن اس کے ساتھ میں تمہاری قابلیت کا بھی مترف ہوں۔“ شیخ کی آواز جذبے سے کانپ رہی تھی اس کی آنکھیں تمذاک تھیں۔

”میں حرامی ہی تھی میں ایسے آدمی کی دوستی اچھی ہوتی ہے۔“ ہاتھ ملاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ”زندگی میں میری یہ پہلو ٹھوکر ہے۔“

”ٹھوکر تو لوگی ہی نہیں۔“ افضل مسکرا کر بولا۔

”لگی ہے۔“ شیخ نے جواب دیا۔

”صرف ترقی ہی بند ہوئی ہے نا۔“ افضل نے کہا۔

”ٹھوکر دل پر لگتی ہے تجوہ پر نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔“

بیراگن

جاورا چھوڑنے کے بعد ایں کا دل پھر سے اچٹ ہو گیا۔ محبت کے متعلق اس کے احساسات میں تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دوسرا پہلو کی تلخی کا احساس ہوا تھا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا یہ زندگی ہے۔ کیا زندگی میں انصاف کو دخل نہیں۔ کیا اللہ میاں بھی مسٹر معروف کی طرح خالی ایڈ مسٹریشن کر رہے ہیں۔ کیا وہ بھی ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔

سکول کی فضائے وہ بے زاد ہو چکا تھا۔ یہ ادارے جہاں ملک کی آئندہ نسلوں

کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر کی عجیب و غریب ذہنیتوں کی وجہ سے تعفن سے بھرے ہوئے تھے۔ اساتذہ کے انداز میں خود پرستی جا بردیت اور جھوٹے وقار کی جھلک تھی اور ان پر بے حسی کا کلف لگا ہوا تھا۔ انکے خیالات میں وسعت کا فقدان تھا۔ گھر یو معاملات کے الجھاد کا عکس انکی شخصیتوں میں جھلکتا تھا۔ وہ علم کی ظاہری شکل پر کوڑتھے۔ مفہوم ان کی نگاہ سے او جھل تھا۔ ایسی کی نگاہ میں وہ سب کیڑے تھے۔ دینکرنے والے کیڑے، سینٹرل ماڈل سکول کے کلاس انچارج کی طرح وہ چھڑی کے سہارے پھلی رہے تھے۔ لذا ایمان تھا کہ چھڑی ہاتھ میں ہوتے سب مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔

اور ایلی کو سب ہے بڑا ذر تھا کہ ایک روز وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ وہ بھی خلاصوں میں لکھی ہوئی تاویلیوں کو علم بخشنے لگے گا۔ بچوں کے ذہن پر آئنی پابندیوں ڈالنے کا خلاق سے تعبیر کرے گا اور پھر وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا۔

اس خیال پر اس کا دل وھک سے رہ جاتا۔

”نبیمیں ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

جاورا کی سارش سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ اس کے ذہن سے شہزادی کی بے وفا کی تلخی دور ہو چکی تھی۔ اگرچہ کامناویے ہی لگا تھا لیکن وہ ورد بیٹھے درد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

شہزادی کے وفا کی نے ایلی کے جذبے کو کم نہیں کیا تھا البتہ اسے قائم کر دیا تھا۔ تقویت بخش دی تھی۔ طبعی طور پر ایلی بے وفا محبوب سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ اس کے نزدیک محبت فرحت بخش جذبہ نہ تھا۔ بلکہ فرحت بخش جذبات تو اسکی نگاہ میں عیش پرستی کے مظہر تھے اور محبوب پر شک و شبہ کرنیکی عادت جو اس نے پال رکھی تھی اسی وجہ سے تھی۔ اگر محبوب بے وفا نہ کرے تو اسکی محبو بیت کی حیثیت قائم رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ اس پر موہول بے وفا تھوپ دیجائے اور خیالی رقیب قائم کر

کے محبت کے جذبہ کو حقیقی بنالیا جائے۔

جب سے وہ شہزاد کے گھر سے اکلا تھا۔ ایلی کے ذہن میں شہزاد کی محبوبیت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ اب وہ بے وفا حسینہ ایلی کے تختیل میں رقبہ سے نہستی کھیاتی نظر آتی تھی اور ایلی کی طرف دیکھ کر نفرت بھرا تھہ لگاتی۔ ”تم“ اس کے ہونٹ تھیڑے پتوں اسماں جاتے اور اس کا تھہ گونجتا۔ اس پر ایلی محسوس کرتا کہ واقعی اسے شہزاد سے محبت ہے اور اس کی محبت کو عیش پرستی سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

اب وہ ایک پچھلے عاشق کی طرح امید پر جی رہا تھا کہ ایک روز شہزاد کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ محسوس کرنے کی کہ واقعی ایلی اس کا سچا عاشق تھا اور رقبہ تو صرف مطلب پرستی کیلئے اس کا ساتھ بنا ہوا تھا۔ پھر وہ مخفوک طلب کا رہو گی اور آ کر اس کے قدموں پر گر پڑے گی۔ مگر وہ سوچتا۔ میں اسے قدموں پر گرنا تو میرا کام ہے۔ میں قدموں پر گر پڑوں گا اور اس کا ہاتھ بڑھ کر مجھے تھپکے گا اور اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھٹڑی لگ جائے گی اور وہ رک رک کر کہے گی۔ مجھے معاف کر دو ایلی۔ مجھے معلوم نہ تھا اس وقت میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا اور پھر

لیکن پھر کا کیا سوال۔ جس مقصد کے لئے وہ جی رہا ہے۔ وہ تو پورا ہو چکا ہو گا۔ پھر اس کا زندہ رہنے کا بھلا کیا فائدہ۔ پھر اس کے قدموں میں پڑے پڑے اس کی روح نفس عنصری سے پرواز کر جائے گی اور اور یہ دیکھ کر شہزاد کی چینیں نکل جائیں گی اور وہ بیرون ہو جائے گی اور گلی گلی اکتارے پر گاتی پھر گی۔

اے رہی میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو ساوی کے نقش ایلی کے دل سے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غالباً اس لیے کہ اس کا چہرہ ہمیشہ مجنسم دکھائی دیتا۔ اس کا جذبہ ہمیشہ جوان نظر آتا۔ اس کا خیال ہمیشہ ایلی کے دل میں زندگی اور رنگینی کا تصور پیش کرتا۔ ساوی کے خیال کے ساتھ آتش رقاہت کی جلن محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسے ساوی کی محبت پر کبھی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔

اس نے کبھی کسی رقیب کے وجود کے امکان کے متعلق نہ سوچا تھا۔ کوئی خیالی رقیب پیدا نہ کیا تھا۔ شاید اس کی ضرورت نہ محسوس کی تھی۔ ساوی کا خیال ایلی کے لئے زندگی اور نگینی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتا اگر وہ ساوی سے مسلک ہو جاتا۔ اگر رکاوٹیں نہ ہوتیں اگر ایسا یوں قطعی طور پر انکار نہ کرتے اگر ان کے انکار کے باوجود وہ آگے قدم بڑھا سکتا۔ اگر ساوی یہ اعلان نہ کرتی کہ وہ اس سلطے میں مجبور ہے۔ اگر اس کے انداز میں قطعیت نہ ہوتی۔ اگر وہ اتنی دور گر وکل ریاست کو مراجعت نہ کر جاتے۔ ایسی ریاست جس کا وجود ایلی کے لئے اس قدر موبہوم تھا۔ جیسے وہ الف لیلی کا شہر ہو تو ایلی ساوی نے شادی کر کے کتنی اچھی زندگی بسر کر سکتا۔ لیکن شاید یہ خیال اسے صرف اس لئے آتا تھا کہ وہ ہماری بائی نے شادی کر کے شہزادے انتقال لے سکتا تھا۔

جاورا سے تبدیل ہو کر جب وہ چک بالا پہنچا تو چند ہی دنوں کے بعد اسے جمیل کا ایک تار ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ گروکل ریاست سے ایک خط موصول ہوا ہے۔ یہاں آؤ تو ملے گا۔

جمالا اور چنگاری

جب وہ خان پور پہنچا تو علی احمد نیچے جھاؤ کر اس پر جھپٹ پڑے۔

”بھائی ایلی نے تو حد کر دی۔“ وہ بولے۔ ”مسٹر معروف کہہ رہے تھے کہ انکوارری میں وہ باتیں کیس آپ کے فرزند نے کیا بتاؤں اس کو تو وکیل ہونا چاہیے تھا۔ ہی ہی ہی۔“ وہ بنتے۔ ”مسٹر معروف نے ایلی بڑی تعریف کی اور نصیر کی ماں پتہ ہے کیا کہنے لگتے۔ آخر کیوں نہ ہو کس باپ کا پیٹا ہے۔ ہی ہی ہی۔ ساری تباہ مجھ پر توڑ دی۔ لیکن ایک بات ہے نصیر کی ماں کہتے تھے دستور کے مطابق ایلی کو سپنڈ کر دینا چاہیے تھا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“ راجونے پوچھا۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ نہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوکری سے چھٹی۔“

”ہے۔“ وہ چلائی۔

”ہاں۔“ علی احمد بولے۔ ”لیکن ہمارا بینا ہے نا۔ مجھی۔ کیا مجھی؟“ ایلی کو اس پر غصہ آگیا۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی وجہ سے نوکری پر قائم ہوں۔ ایلی نے دبی زبان سے کہا۔“

”بالکل۔“ وہ بولے۔ ورنہ ایک دن نوکری نہیں کر سکتے تم۔ علی احمد جلال میں آگئے۔

”یعنی مجھ میں ذاتی طور پر قابلیت نہیں کہ نوکری پر فائز رہ سکوں۔“

”لو۔“ راجو بولی۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ معروف ایلی کی تعریف کر رہے تھے۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ نہے۔“ تمہیں کیا پڑتا۔ قابلیت کوئی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ قابلیت جو ایلی میں ہے۔ نوکر شاہی کی قابلیت نہیں۔ یہ تو اپنے ہی پر چلانے کی قابلیت ہے۔ نہ یہ تیل دیکھ سکتا ہے۔ نہ تیل کی دھار یہ تو پڑوں میں چلتی ماچس پھینک سکتا ہے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہٹنے لگے۔

پھر انہوں نے ایلی کو نصیحت کرنا شروع کر دیں۔

”دیکھو ایلی۔ نوکری میں ہمیشہ اپنے امی افسر کا ساتھ دینا چاہیے۔ مجھے چاہے وہ اچھا ہو یا برا غلطی کر رہا ہو یا ظلم۔ تمہیں اس سے کیا اور یاد رکھوں پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ کیسے کرے گا۔ کیسے کرے گا۔ اسے معلوم نہیں کہ تم کس کے بیٹھے ہو اور ہمارے معروف سے کتنے تعلقات ہیں۔ یہ لوگ آنکھوں کے اندر ہے ہوتے ہر بات کی خبر رکھتے ہیں اور دیکھوں اگر اپنے افسر کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہو تو۔“ وہ بولے۔“

تو خود کچھ نہیں کیا کرتے بلکہ دوسروں کو اکسادیا۔ وہ سنانے کا تم نے نصیر کی مارتم سے

کیا چھپا ہے؟! ہی ہی۔ فرائیلی کو سمجھا دو یہ گریٹ آرام دہ رہتا ہے۔“

ابا کی باتوں سے اکتا کرائیلی جمیل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں نقی کے مکان پر

رک گیا۔ دروازہ ٹھکٹھایا۔

”نقی صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے نوکر سے پوچھا۔

”جی وہ تو شکار پر گئے ہیں۔“ نوکرنے کہا۔

”شکار پر؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”کسی خاص تقریب پر گئے ہیں کیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”وہ تو اکثر شکار پر جاتے ہیں۔“

”اے وہ تو جوتے سیا کرتے تھے۔“

”جی بابو جی۔“ نوکرہنسا۔ ”پہلے جوتے سیا کرتے تھے آج کل شکار کھلتے ہیں۔“

”اے۔“ ایلی نہس پڑا۔ ”پہلے چڑیاں کاڑھتے تھے۔ پھر جوتے سینے لگے اور

اب شکار۔“

مالٹا مٹھا

ایلی کو دیکھ کر جمیل کی باچھیں کھل گئیں۔

”یا رتم آگئے۔“ وہ بولا۔ بڑا اچھا کیا تم نے دو چار روز رونق رہے گی۔ مزا آجائیگا۔“

”اور وہ خط؟ کیا صرف مجھے بلانے کا بہانہ تھا؟ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری قسم۔ تم سے جھوٹ نہیں۔ تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ آج تک کوئی چالاکی نہیں کی۔“

ایلی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”چے ہوئے ہو کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”بھی وہ۔“ وہ نہ سا۔ ”یہ کیا چھپانے کی بات ہے۔ بڑی بہادری کی تم نے کہ بو جھو لیا۔ اے بھائی جب خاموشی سے تمہاری بات سنوں تو سمجھ لو کہ خالی ہوں اور جب بات کروں تو سمجھ لو کہ قائم ہوں۔“

”نشہ و شہ نہیں ہوتا اور ہونے زبان کے رنگ اتر جاتا ہے۔ بس اتنا صرف اتنا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”تم سمجھتے ہو۔“ جمیل بولا کہ صرف تمہیں ہی سمجھتی ہیں۔ یہ فلٹ ہے شاید مجھے تم سے بھی زیادہ سمجھتی ہیں تم سے زیادہ انکھی۔ لیکن جب مالٹا مٹھا کا اوھیا اندر نہ ہو زبان گنگ رہتی ہے۔ سال کو وہ زنگ لگا ہوا ہے کہ اتر تا نہیں۔ تم پی کر آپے میں نہیں رہتے میں پی کر اپنے آپ میں آ جاتا ہوں۔ بس اتنا فرق ہے۔“

”بکونیں۔“ ایلی بولا۔

”لو۔“ جمیل چلایا۔ ”ہم بات کریں تو بکونیں۔ بھی وہ اور تم خود باتیں کرو تو Pure wisdom تمہاری بات عقل کا نچوڑ ہماری بکواس اچھا انصاف ہے۔“

”اچھا وہ خط نکالو۔“ ایلی نے کہا۔

”خدا کی قسم۔“ جمیل بولا۔ کیا خط ہے۔ وہ وہ اگر مجھے کوئی ایک محبت بھرا خط لکھ دیتی تو کبھی بوتل کاحتاج نہ ہوتا عمر بھر لیکن کسی حرام زادی نے نہیں لکھا اور نتیجہ یہ ہے۔ جب تک اندر مالٹا مٹھانہ جائے بات نہیں بنتی۔“

”تمہاری بیوی نہیں منع کرتی تمہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پہلے پہل جب نئی نئی آتی تھیں تو کیا کرتی تھی۔ اب نہیں خدا کی قسم اب تو اکساتی ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”کبھی توبہ کر لوں تو مصیبت پڑ جاتی ہے اسے پھر وہ بہانے بہانے مجھے اکساتی ہے کتو بتو ڈوں۔“

”لیکن کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

وہہ شنے لگا۔ ”اسے معلوم ہو گیا ہے کہنا و پانی بغیر نہیں چلے گی۔“

”تمہاری ناؤاقعی اس پانی کے بغیر نہیں چلتی۔“ ایلی نے کہا

”اوہہوں۔“ جمیل ہشنے لگا۔ ”میری ناؤکوون پوچھتا ہے چاہے چلنے چلے۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بھئی اس کی ناؤ نہیں چلتی عجائب چل رہے تا۔ مالٹا مٹھاں میں پیوں اور ناؤ اس

کی چلے۔“ وہ تھقہہ مار کر ہشنے لگا۔

”لیکن وہ خط و کھاڑے ایلی نے کہا۔

”وہ خط و کھانے والا نہیں۔“ جمیل بولا۔ تغیر بنا کر گئے میں ڈالنے کی قابل ہے۔ میں نے ایسا خط بھی نہیں دیکھا۔ تم بڑے خوش قسمت ہو خدا کسی قسم بڑے خوش قسمت ہوا اگر مجھ سے کوئی اس کا دسوال حصہ پیار کرتا تو میں نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا کی قسم اور پھر وہ تو عالم ہے۔ عالم اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پائے کا عالم ہونے کے باوجود اس میں لڑکی بے حد نہیاں ہے ورنہ پڑھ لکھ کر یہ آج کل کی چھوکریاں نسائیت کھو دیتی ہیں۔ سچ کہنا ٹھیک کہتا ہوں یا نہیں اور پھر خط اس نے تمہیں نہیں لکھا۔“

”تو پھر کس کو لکھا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اپنی بھا بھی کو۔“

”کون ہی بھا بھی؟“

”اس کا کوئی بھائی ہے۔“ وہ بولا۔ انصر نام ہے یا انصیر مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس کا نیا نیا بیاہ ہوا ہے اسکی بیوی کو خط لکھا ہے۔ تو پھر یہاں کیسے آگیا۔ وہ خط۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ شعر ناہے تم نے شراب بیخ پڑاں کباب شیشے میں۔“ جمیل

گانے لگا۔

”تو یہ کسی کے آنے کی اجازہ ہے۔“ ایلی نے کہا۔

جمیل ہنسنے لگا۔ ”خط اسے لکھا ہے۔ لیکن اس بے چاری کے نام صرف سر نامہ ہے باقی سارے خط میں تمہارا مذکور ہے اور تمہارے خیال سے اس قدر بھری بیٹھی تھی کہ لفاف پر پڑھی تمہارا ہی لکھ دیا۔ واہ واہ واہ۔ لیکن ہو تو ایسی ہو۔“ وہ ہنسنے لگا۔

ایلی نے وہ خط پڑھا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ ساوی کے جذبہ کی شدت مجسم ہو کر اس کے رو برداشت کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز بیان میں اس قدر جذبہ اس قدر لطافت اور رنگی تھی کہ وہ تریپ گیا۔ اس نے بھی ساوی کے دکھ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے لاشور میں ساوی اور غم دو متضاد چیزیں تھیں۔
لیکن ساوی کا خط پڑھ کر ایلی پر گویا دھکا ایک پیارا آگرا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جائے اور پھر جو گی بن کر پیارا ہی پر جائیں۔

وہ ایک دن تو وہ پڑا آئیں بھرتا رہا پھر شدت جذبہ سے مجبور ہو کر علی احمد کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس نے ساوی کا مذکورہ پھر سے چھیڑ دیا۔ علی احمد پہلے تو اس کے تیور دیکھ کر گھرا گئے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پینترابدلا اور اپنی عادت کے مطابق ہنسنا شروع کر دیا۔ ”نصیر کی ماں یہ سناتم نے ہی ہی ہی۔“ اور اس ہی ہی ہی میں بات دب کر رہ گئی۔

ایلی کے مبنی بس کو چار سال گزر جکے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے
خیالات میں خاصی پختگی پیدا ہو چکی تھی مطالعہ سے حاصل کرنے ہوئے کئی ایک
نظریات کو وہ عملی زندگی میں آزمائچا تھا۔ اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔
اگرچہ بنیادی طور پر اس کے لروار اور شخصیت کی دیواریں اسی احساسِ مکتری پر کھڑی
تھیں۔ لیکن اب اس کے برداشت سے اس حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ گونگاہ
رہا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو میں ایک جائز بیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے دوست اور ساتھی
اس کی باتیں سنتے اور سرد ہفتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلی نے التزامِ زندگی کے
متعلق ایک انوکھا نکتہ نظر استوار کر رکھا تھا۔ جو سبی زاویوں سے ہٹ کر رہا۔

در اصل اس کا عکلکھول سلف ایک کولے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کے تلے اس کی
جذباتی انا کیڑے کی طرح چھپی ہوئی تھی۔ مطالعہ نظریات اور پختگی خیالات کا اس کا
جذباتی تاریخ پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ایک بچہ تھا۔ وہ بچہ مار کھا کر
روتے روتے سو گیا تھا۔ ایلی کو خوف دامن گیر رہتا کہ یہ بچہ پھر نہ جاگ
پڑے۔ اسے ڈرتھا کوہ جاگ پڑیگا۔ اور پھر سے بسونا شروع کر دیگا۔ اس بات کا
مطالبہ کرے گا۔ کہ ماں سے تھکے مانتا سے اس کی واپسی جوں کی توں قائم تھی۔ اس
کے گروپ پیش کئی ایک نوجوان لڑکیاں تھیں جو پروں سے جھانکتی تھیں تھیں لگا کر آواز
نشر کرتی تھیں۔ شرما کر چھپ کر ڈھونڈنے کی دعوت دیتی تھیں۔ ان میں ول فربی
تھی حسن تھار عنائی تھی۔ لیکن مامتانہ تھی۔ وہ جگاتی تھیں تھیک کر سلاطی نہ تھیں ان میں
سپردگی تھی۔ لیکن گروپیں اٹھانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے وہ ایلی کو اپنی طرف
متوجہ نہ کر سکیں۔ اور مامتا بھری تھیکی کی عدم موجودگی میں ایلی اپنے محنت سے پیدا

کئے ہوئے اچھلچوں کوئے میں سوتا رہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے اسے آرزو تھی کہ وہ جاگ اٹھے۔ ڈھکی چپچی آرزو اور ممتاز بھرے ہاتھ سے تھپکیں تھپکتے اٹھا کر ممتاز بھری گود میں ڈال لیں۔

اسی ڈر کے مارے چار سال وہ علی اپرنہ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سویا ہو بچہ پھر سے نہ جاگ پڑے وہ سویا جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ ٹوٹ نہ جائے اور لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں کہ وہ وہی پرانا کیڑا ہے۔ ٹپپلا۔ رینگتا ہو اکیرا۔

اس کے باوجود جب کبھی علی اپر سے کوئی آنالوہاں سے خبر آتی تو ایلی کے کان کھڑے ہو جاتے۔ بظاہر بے پرواں دکھاتے ہوئے بڑی وجہ سے علی اپر کی باتیں سنتا اور پھر تہائی میں بیٹھ کر بڑے انہاں سے خبروں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑتا اور پھر انداز سے لگاتا کہ شہزاد کا کیا حال ہے اور صدر اور شہزاد کے تعلق کے متعلق محلے والوں کا کیا خیال ہے کیا شہزاد اشریف کے ساتھ نہیں جاتی۔

شروع شروع میں محلے سے جو خبریں آتی تھیں ان میں شہزاد اور صدر کا بہت چہ چا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دونوں کا ایک دوسرا بغير دم نکلتا ہے وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر آوازیں دیتی رہتی ہے۔ وہ منڈپ سے جھانکتا ہے۔ ”چھی سو دنگواوگی۔ آج تو کریلے پکاؤ اور وہ جوز یورتم نے بنوایا تھا۔“ کھڑکی میں کھڑا رہتا ہے دونوں نہ نہ کر باتیں کرتے ہیں۔ وہیں کھڑے دوپھر سے شام ہو جاتی ہے۔ نہ جانے ان کی باتیں ختم کیوں نہیں ہوتیں رات کو گراموفون کو سر ہانے بیٹھ کر گیت سنتے ہیں۔ آدمی رات بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے نہیں تھکتے۔

پھر آہستہ آہستہ باتیں رنگ بدلتی گیں۔ صدر کے شراب کے نشے میں دھت رہنے کی باتیں چل نکلی تو بہ ہے ہر وقت بوتل منہ سے لگائے رہتا ہے۔ اور کیوں نہ

ہو۔ شہزاد کمال ہے کیوں نہ لٹائے مفت کی تو کہتے ہے قاضی بھی نہیں چھوڑتا اور صدر تو نہ پچنے کا شرایبی ہے پی کر دنگا کرتا ہے۔ بیوی کو پیٹتا ہے۔ چیخ چیخ کر شعر گاتا ہے۔ اگر چہ ایلی کو یقین تھا کہ اسے ان باتوں سے قطعی دل چھپی نہیں اسے قطعی طور پر پروانہیں لکھے شہزاد کھڑکی میں گھٹی رہتی ہے یا بازار میں صدر نمازیں پڑھتا یا شراب کے نشے میں وہت رہتا ہے۔ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہ باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ صدر کے شراب پی کر چلانے کی بات سن کر اسے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اعتراف وہ اپنے آپ بے بھی نہیں کرتا تھا ایک پرائیوریت خفیہ خوشی۔ اب شہزاد کو سمجھ آئیں۔ اب وہ جانے کی کہ پچھے اور جھوٹے عشق میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ان چار برس میں علی پور جانے کے کئی ایک موقعے طے تھے۔ لیکن ایلی نے جان بوجھ کر علی پور جانے سے احتراز کیا تھا وہ علی پور سے ڈرتا تھا۔ وہ شہزاد کی آواز سنتے سے ڈرتا تھا وہ آواز جو محلے میں گوئھی تھی جس کے سرے محلے والیوں سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جس میں لائھی زیر و بم تھا۔ وہ عجیب سی جھنجلاہٹ تھی۔ جو سیدھی دل پر اثر کرتی اور پھر نس نس میں دھنکی سی بھتی۔

ہر سال جب سکول گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے ڈیڑھ ماہ کیلئے بند ہو جاتا تو ایلی مشکل میں پڑ جاتا چھٹیاں گزارنے کے جب وہ خان پور جاتا تو کوئی نہ کوئی علی پور کی بات چھیڑ دیتا۔

مثلاً علی پور احمد کہتے۔

”نصیر کی ماں کتنی خوشی کی بات ہے کہ ایلی چھٹیاں ہمارے پاس بر کرتا ہے۔“

”بے چارہ اپنی ماں سے ملنے سے بھی گیا۔“ راجودبی زبان سے کہتی۔

”اس کا نام زندگی ہے نصیر کی ماں۔ علی احمد چلاتے۔“ کبھی وہوپ کبھی چھا

وں۔“

”میں نے کہا۔“ راجو سے دلکھ کو بولی ”ایں آیا ہے۔“

”لیکن _____“ راجو کہتے کہتے رک گئی۔

”لیکن _____ علی احمد چلانے لگے۔

راجو کی آواز مدم پڑ گئی ”هم تو علی پور جا رہے ہیں۔“

”تو پھر _____ تو مطلب کی بات کر۔“

”مطلب یہ؟“ اس کی آواز اور مدم پڑ گئی۔ وہ کہاں رہے گا چھپیوں میں۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد نے نصیر کی ماں تو بھی ہمیشہ باوندری لگاتی ہے۔

اسے بھی ساتھ لے چلو آخر ایک دن جانا ہی پڑیگا۔ آج نہیں کافی۔ کل نہیں پرسوں۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منایں گے۔ ہی ہی ہی۔ وہ ہٹنے لگے۔“

جب وہ علی پور پہنچ تو محلے کا احاطہ محلے والیوں کی آوازوں سے گوئختے لگا وہ سب علی احمد کو چھپیر نہ لگیں۔

تاقالہ

دفعاً ایں کو خیال آیا۔ وہ گھبرا گیا۔ اس محسوس کیا کہ احاطے کے میدان میں کھڑی رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس نے چند ایک لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ڈیوڑھی میں جا کر رک گیا۔ اس کا دل بھی ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ باہر چیلیں چیخ رہی تھیں۔ کوئے کامیں کامیں کر رہے تھے اور ان میں علی احمد کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”کون؟ علی احمد آیا ہے؟“

دفعاً ایک مختلف نوعیت کی آواز سنائی دی۔ انوکھی۔ سریلی۔ پنجم آواز۔ ایں کا دل ڈوب گیا۔ جسم میں اہریں ہی چلنے لگیں۔

”ہئے یہ تو سارا قافلہ ہے کسی کو چھوڑ تو نہیں آئے پیچھے۔“

”تو گھبراو نہیں۔“ علی احمد بولے۔ ”بھی ساتھ ہیں۔ سمجھی۔“ علی احمد نے قہقہہ

لگایا۔ ”تو اپنی بات سنانہ اوسنا ہے تو نے اپنے میاں کو عاق کر دیا ہے۔“
”وہ کیسے۔“

”لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اسے ریٹارڈ کر دیا ہے۔“

”ص عمر عمر کی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی۔“

”ص عمر تو ڈیولی کی ہے۔ کیوں چاچی۔ جھوٹ کہتا ہوں کیا؟ ہی ہی ہی۔“

”اب کیا رہا ہے پیچھے۔ پنجھ کو بھی۔“

”نگاہیں کھائیں جتھے۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا۔

”نگاہوں کی بجیٹ جو چڑھا دیا اپنے آپ کوں“ ماں مدھم آواز میں بولی۔

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد کا قہقہہ ایلی کے بند بند میں ناچنے لگا۔ ایلی نے

کانوں میں انگلیاں ٹھوں لیں۔

محلے میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ عورتوں نے احاطے کے میدان میں بیٹھ کر چڑھا کا تنا آزار بند بنتا ترک کر دیا تھا۔ سر جھکا کر چلنے والے بڑھے تعداد میں کم رہ گئے تھے۔ محلے کے نوجوانوں کی وہ حالت نہ رہی تھی۔ اب وہ چھاتی نکال کر چلنے لگے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بوڑھیوں کی موجودگی میں سینہ اٹھا کر کھڑی ہو جاتیں۔ نظر بچا کر مسکراتیں۔ بال جھلکتیں۔ بچے بڑوں کا کہانہ مانتے ضد کرتے بڑوں کو منہ پر جواب دیتے محلے کی بوڑھیاں بالکل ویسی ہی تھیں جیسے کہ پہلے ہوا کر تھیں ان میں قطعی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ البتہ انگلی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت سی اور ہر عمر کی عورتیں انگلی صاف میں شامل ہو گئی تھیں۔

ایک نئی چیز جو محلے میں داخل ہوئی تھی۔ گراموفون باجہ تھا پہلے تو محلے میں صرف ایک باجا ہوا کرتا تھا۔ جو بالا کے کمرے میں یوں بجا کرتا تھا جسے مکھیاں بھن بھنارہی ہوں بالا کے پاس چند ایک پرانے ریکارڈ تھے۔ جن کی آواز اسکے کمرے میں گھٹ کر رہ جاتی تھی جو چلتے چلتے میرا نام جاںکی بالی اللہ والی کہہ کر ختم ہو

جاتے تھے۔ جنہیں سن کر بوڑھیاں ہاتھا چلا کر چلا تھیں۔ اے ہے یہ باؤ لاؤ کیا تو
ے سے گھساتا رہتا ہے ہر وقت کی ٹیکنیک نہ شرم نہ حیا۔، لیکن باؤ تو باؤ لاتھا۔ اس
ے جھگڑے کا سوال ہی پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ آسیب زدہ لوگوں سے بھلا کیا جھگڑا
اس لیے بالا بجہ محلے میں سکیان لیتا رہتا تھا۔ بوڑھیاں چلما رہتیں۔ بala ہی ہی
ہی کر کے سنتا رہتا۔

اب محلے میں کئی ایک باجے آگئے تھے ان پر ایسے ریکارڈ چلتے جو ہنہ نہ تھے نہیں
بلکہ گاتے تھے اور گانے کے بول دوڑ دوڑ تک صاف سنائی دیتے تھے روز رات
کیوقت کوئی نہ کوئی باجا بختی لگتا اور دیر تک گیتوں کی آوازیں محلے میں گونجتیں اکثر
یسا ہوتا کہ دو باروں کی آپس میں شرط باندھی جاتی اور وہ باری باری ریکارڈ بجائے
مقابلے کے شوق کی وجہ سے باجے والے نئے نئے ریکارڈ خریدتے تاکہ حریفوں
سے بازی لے جائیں۔

محلے والوں نے ان کے باجے کے خلاف ضرور احتجاج کیا ہوگا۔ ظاہر تھا کہ ان
کی آواز میں اب وہ اثر نہ ہو رہا تھا۔ بوگیں تو وہ اب تھیں۔ انہیں تو بولنے سے دل
چھپی تھی اثر پیدا کرنے سے نہیں محلے کے جوان اب ان باتوں کو درخود اعتنا نہیں
سمجھتے تھے۔ بولتی ہیں تو پڑی بولیں آپ ہی تھک جائیں گی۔ بہر حال ابھی تک ان
میں اتنی جرات پیدا نہ ہوئی تھی کہ بوڑھیوں کی بات کا ٹیکنیک یا ان کی بات کا جواب
دیں۔

بکھری کہانی

اتنی دیر کے بعد ایلی سے مل کر محلے والیاں بے حد خوشیاں ہو گئیں گویا انہوں نے
اسکے پرانے گناہ سب کے سب معاف کر دیئے تھے۔

”اے ایلی ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر چلا تھیں۔ اے اتنی دیر کے بعد دیکھا ہے
تجھے۔ جی نہیں چاہتا تھا تیر اوطن آنے۔ اے تو نے توحد کروی۔ محلہ چھوڑ اتو بالکل ہی

چھوڑ دیا پہلے تو باہر جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ پھر جو چھوڑ ا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔“

پھر وہ ایلی کے قریب تر ہو جائیں۔ ”اچھا ہی کیا تو نے جو اس دلدل سے نکل گیا مردوں کا کیا کام کہ دلدل میں سچنے بیٹھے رہیں مرد تو چلتے پھرتے گھوڑے ہوتے ہیں۔“

”اے کوئی جگہ ہوئی تو جانکی بازی لگاتا۔ وہ تو بارہ دری ہے بارہ دری ایک آیا ایک گیا اچھا ہوا تیری جان چھوٹی۔“

اے میں نے کہا ایلی کچھ معلوم ہے تمہیں اس اللہ مارے شرابی نے کیا کیا بھی کر کھایا اسے۔ سمجھ لو چھوڑ لیا۔ اچھا ہوا اسے بھی سمجھاتی کی کیا کیا ہوتا ہے لیکن اسے کیا سمجھ آئے گی۔ وہ تو کہتی ہے لوٹ اور خود لئے کے لیے بے قرار ہے۔ خاوند سے بگاڑ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ تو بدھو۔ ورنہ عورت کی کیا مجال ہے۔ کہ خاوند کا کہا نہ مانے۔ اس بے چارے نے ہزار میں کیس کہ چل میرے ساتھ چل لیکن اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”اے ہے۔ اب تو لڑ کیاں جوان ہو چکی ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی بہت سے باز نہیں آتی۔ ادھروہ کالے منہ والا شرابی رواز پی کی بیوی کو پیٹتا ہے پھر ڈھیٹ کہیں کا اسے آوازیں دیتا ہے چیختا ہے چلاتا ہے ملتیں کرتا ہے اور جب کھڑکی نہیں کھلتی تو پھر سے بیوی کو پیٹنے لگتا ہے۔ تو بے ہے۔ اتنے بے شرم ہو گئے ہیں۔ کتو بے ہے نہ کسی کی شرم نہ لحاظ۔“

ایلی ان کی باتیں سن کر ان ٹکروں کو جوڑتا رہا بہر حال وہ خوش تھا۔ ہنگامہ ہوا چھا ہوا اسے سمجھ میں آگیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ سچا عشق کے کہتے ہیں۔

خوشی کے باوجود ایسی باتیں سن کر اس کے دل پر ٹھیس لگتی۔ اس نے اپنا آپ تباہ کر لیا عزت و ناموس گنوادیا۔ اپنی جوابی بر باد کر دی۔

ہاجرہ نے ایلی کو گلے سے لگایا۔ اس کے آنسو شپ کرنے لگے۔ ”ہے ایلی تو

تو ہم سے ملنے سے بھی گیا پہلے ہمارے پاس رہ ک ہمارا نہ تھا۔ اب ساتھ ہم کو بھی چھوڑ دیا۔ تیرا جی نہیں چاہتا تھا علی پور آنے کو اس سے تو وہی دور اچھا تھا۔ تمہیں دیکھ تو لیتے تھے۔ اب تو دیکھنے سے بھی گئے۔

ہاجرہ روئے جا رہی تھی اس کے پیچھے فرحت چپ چاپ کھڑی تھی۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہے۔

”چل ادھر فرحت کی طرف۔“ ہاجرہ بولی۔ ”تو کیا ادھر علی احمد کے گھر رہے گا۔ اکیلا ہی۔ نہ بیٹا چل ہمارے ساتھ رہ جیسے ہمیشہ رہا کرتا تھا۔“

فرحت کی طرف جا کر رہنا گویا پھر سے منجد ہمار میں کو دنے کے متراوف تھا۔ وہاں شہزادی۔ صرف ایک چیز اور زینہ حائل تھا ایلی ادھر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔

”تو بھی حد کرتی ہے اماں۔“ فرحت بولی۔ ”اگر ایلی کا جی ادھر رہنے کو چاہتا ہے۔ تو تو اسے کیوں مجبور کرتی ہے۔ ادھر لے جا کر خواہ نخواہ پھر سے مصیبت سر پر کھڑی کرنی ہے کیا۔ مشکل سے جان چھٹی ہے پہلے ہی۔“

”اچھا،“ ہاجرہ بولی۔ جس طرح تو خوش رہے۔ جیسے تیری مرضی۔“

ایلی کو یقین تھا کہ شہزادی احمد کے گھر آنے کی جرأت نہ کرے گی اور اگر آئی بھی تو اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس کا سامنا کر سکتا ہے اسے تو صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ اکیلے میں ایلی کے رو برو آ کھڑی ہو پھر اسے خیال آتا کہ آخر وہ کیوں آئیں گی۔ اس کی آمد کا خطرہ دراصل محض خوشی نہیں ہے۔ آخر سے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چار ایک دن کے بعد ایک روز علی احمد اور گھر کے جملہ لوگ علی احمد کے کسی دوست کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے انہیں صرف چند ایک گھنٹے کے لیے باہر رہنا تھا۔ ایلی نے اس بات کو چند اس اہمیت نہ دی۔ اس لیے وہ کتاب اٹھا کر ایک

الگ کمرے میں جا بیٹھا اور مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

ہاں ہوں

اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوتی تھی۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پیشتر کے کوہ سراٹھا کر دیکھتا رہتی پہنچ ایک خوشبودار گھڑی اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی گھڑی کے اور پروالے سرے پر سیاہ ناگن سی بل کھاے ہوئے تھی۔
وہ چونکا کون ہے۔“

گھڑی سے دلی ہوتی سکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایں چھرا گیا۔

اس نے چوٹی کو اٹھایا ماتھے پر ٹھنڈا کیجھ کر اس کا دل ڈوب گیا اس نے چوٹی کو چھوڑ دیا دھرم سے گھڑی پھرتے لگی۔ سکیوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔
اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹھوکر مار کر اس رہتی گھڑی کو پر ہٹاوے اور پھر خراماں خراماں کمرے سے باہر نکل جائے جیسے ہیر و شیخ سے لکھتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ریشمی گھڑی کو اٹھا کر بینت س لگائے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ نہ کہے۔ بیٹھا رہے۔ کیا اپنے شرابی محبوب سے اکتا گئیں۔ کیا دل بہلانے کے لیے کوئی اور نہیں ملتا۔“

”مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس کے قدموں میں گری ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی عظمت کا اعتراف کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس سے عظیم تر لمحہ اس کی زندگی میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ خوش تھا اس کی تذلیل پر خوش تھا۔ اسکے اعتراف شکست پر خوش تھا۔ وہاں وہ چاہتا کہ یوں ہی بیٹھا رہے۔ دیوتا بن کر بیٹھا رہے اور اس کے قدموں پر وہ سر نگوں رہے۔

تمام دنیا پر سنانا چھایا ہوا تھا۔ کائنات گویا رک گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا۔ صرف دیوتا اور پشیمان پچاری، کائنات کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ صرف وہ دونوں باقی رہ گئے تھے۔ یا پھر ایک خلا تھا۔ و سعتوں کو گھیرے میں لئے ہوئے ایک

صد یوں خاموشی طاری صرف ہچکیاں لبی۔ دلبی۔ دلبی ہچکیاں پھر کپڑوں کی گٹھڑی میں حرکت ہوئی حرکت ہوئی۔ پیشانی کا سیاہ گل ابھرا۔

”میں میں تم۔“ آبدیدہ ہیکنی نے اس کی بات کاٹ دی

”تم ہو؟“ ایلی نے نفرت بھرے انداز سے کہا بناوٹی نفرت۔

”ہاں میں۔“

”تم۔“ ایلی کی نگاہ تند جھرمی کی طرح پڑی۔

”ہاں میں۔ چور چور ہوا کہ تمہارے قدموں میں آگری ہوں۔“

”جو شرالی کے ہاتھ کاں بنے۔“

”تم مجھے شرالی کے ہاتھ دے گئے تھے نا۔“

”میں دے گیا تھا؟“ نفرت سے اس نے ہونٹ بیجھ لیے۔

”تم نہ جاتے تو۔“

”اب کیا رکھا ہے؟“ وہ بولا۔

”جس ہے“ وہ اٹھو بیٹھی۔ اس نے معافی بھرے انداز سے چھرے سے بال ہٹائے اور اپنا منہ نگاہ کر کے بولی۔ اب کیا ادھر ہے۔“

وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ اس کے روپ و شہزاد نہ تھی۔ ایک لٹا پٹا چہرہ ویران آنکھیں ہڈیاں بھرے گاں، داغ دار جلد۔ بچھا دیپ، وہ اسے دیکھ کر بھوچکارہ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے سینے پر گھونسamar دیا ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

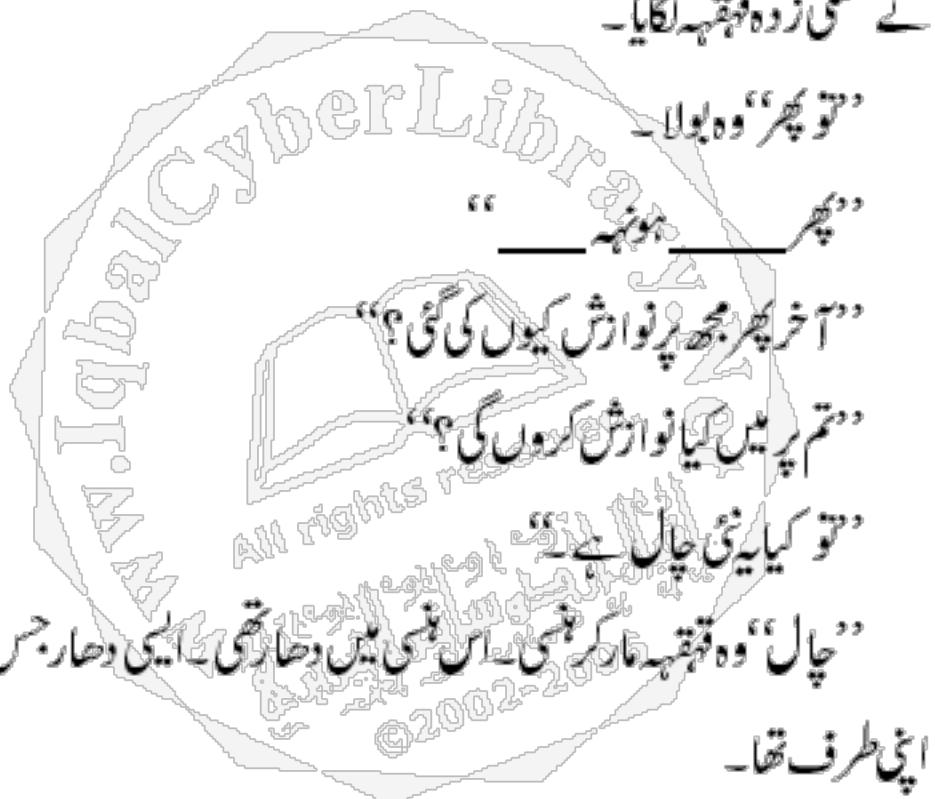
”ہس“ وہ بولی۔ اب کیا رکھا ہے۔ ویرانی، تباہی لئے ہوئے کوکون منہ لگاتا ہے۔ چور چور ہو جائے تو کون ٹکرے چتنا ہے۔ وہ خاموشی کھڑی رہ گئی۔

کمرے کی فضا گویا منوں بوجھل ہو گئی۔

ایک اداں بھاری خاموشی چھا گئی۔

دُور کوئی کراہ رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ سکیاں لے رہا تھا۔

”مجھے معلوم تھا۔“ وہ بولی اب تم بھی منہ لگاؤ گے۔ اب رکھا ہی کیا ہے۔“ اس نے سکی زدہ قہقہہ لگایا۔



”چال“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس نے اسی میں دھار تھی۔ ایسی دھار جس کا رخ اس کی اپنی طرف تھا۔

”گناہ بخشوائے آئی تھی۔ کیا؟“

”چبھی خدا بن کر بیٹھ گئے ہوتم۔“

ایلی بھو نچکارہ گیا اسے کوئی جواب نہ سو جھا۔

”تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔“

”بہر حال تم کو سمجھتا ہوں۔“

”ہونہہ“ نفرت سے اس کی ناک دھار بن گئی۔ ”تم _____ مجھے سمجھتے کیا تم۔ تم مجھے کیا سمجھو گئے تم میں اتنی وسعت ہی نہیں کہ دوسرے کو سمجھ سکو۔ دوسرے کو دیکھ سکو۔ سمجھتا تو اور بات ہے۔“

”جی“ وہ غصے میں بولا۔ ”میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ نہیں سمجھ سکتا۔“

”خود پرست شخص کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔“

”جی میں خود پرست ہوں۔“

”تمہاری خود پرستی نے ہم سب کو تباہ کر دیا۔“

”اس شرایبی کو بھی _____“ اس کی آواز میں تمسخر تھا۔
”ہاں اس نالی کے کیڑے کو بھی۔“

”نالی کا کیڑا؟“

”ہاں۔ اس کا مقصد مجھے لوٹنا تھا۔ اس نے مجھے دل بھر کر لونا۔ اور میں جان بو جھ کر لئی رہی۔ مجھ میں اب اپنا آپ لٹانے کی جرات ہے۔“

”اوہ _____“

”تمہاری طرح نہیں کہ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے گے۔“

”میں چلا گیا؟“

”تمہم میں مجھ پر اعتماد نہ تھا تم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تم میں اتنی وسعت نہیں۔ تم شک کے زور پر پیار کرتے ہو۔ محبت کرنا نہیں جانتے۔“ آج تم بھی میر انداز اڑا رہے ہو۔ گری ہوئی کوپاؤں میں رومند رہے ہو میں صرف تمہارے سامنے گری ہوں کسی اور کے سامنے نہیں۔ اتنی گری ہوئی بھی نہ سمجھو مجھے۔“

شہزادی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبری تھیں۔ اس نے دونوں بازوں سینے پر تہہ کیے ہوئے تھے اور وہ یوں کھڑی تھی جیسی جلتے ہوئے جہاز میں کوئی کیسا بیانا کا کھڑا ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی کھڑ کی ٹکٹکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ تلے ایلی ایک انجانی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسے لٹا پا دیکھ کر وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اسے وہ اکیلانہیں چھوڑ سکتا جیسے اس کا ساتھ دینا اس پر فرض ہو چکا ہو۔

سکھ میں چاہے وہ اس کا ساتھی نہ بنتا لیکن دکھ میں وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اب شہزاد کے پاس رہ کیا تھا۔ جوانی ڈھل گئی تی۔ جو بن ختم ہو چکا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کے قدموں پر گر جائے اور رورو کر اس سے معافی مانگ لے لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

دفعتا وہ آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا سر تھام لیا ”لیکن تم یوں

چو ہے کی طرح کیوں دیکے بیٹھے ہو۔ کیوں منہ چھپائے پھرتے ہو۔ کبھی علی پور نہیں آئے۔ اور اہب آئے تو سامنے کیوں نہیں آتے۔ مجھ سے دل چھپی نہیں تو نہ ہی مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن مجھ سے نفرت ہی ہی اعلانیہ نفرت کرو چکو، میرے منہ پر چکو، ٹھوکر مار کر مجھے باہر نکال دو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا منہ اپنی طرف موڑ لیا۔

ایلی نے یوں محسوس یا جیسے پٹا خے کو آگ و کھادی گئی ہو۔ بھن سے اس کا سر ہوائی کی طرح چل گیا اس نے ان چانے میں اٹھ کر شہزادوں والوں بانہوں میں تھام لیا اور پھر دیوانگی بھرے جوش سے اس ریشمی گٹھڑی کو سمیٹ کر اپنی گود میں ڈال دیا۔ پھر وہ نہ جانے غصے میں جوش میں یا نفرت کی شدت کی وجہ سے چینخ لگا۔

”تم کمینی ہو۔ حرام زادی ہو۔ فاٹکشہ ہو۔ تمہیں دوسروں کو تباہ کرنے میں دل چھپی ہے تم انسانوں سے کھلتی ہو۔ تم حرام خور ہو۔“

”ہاں ہوں۔“ وہ بولی ”کرلو میرا کیا کرتے ہو۔ اور پھر گٹھڑی ہی بن کر پڑ گئی۔ ایلی نے اس گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ پھر دفعاً اس کے ذہن میں گاڑی کی کوک سنائی دی۔ گاڑی اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان چھکا چک چلی جا رہی تھی۔ ایک ڈبے میں موگلیارنگ کی گٹھڑی پڑی جھوول رہی تھی۔

”اُرے یا رغضب ہو گیا۔ تباہی بر بادی۔ لٹ گئے۔ ارجمند چلا رہا تھا۔ پھر گٹھڑی کے پٹ کھلے اور دوحتائی ناگ باہر نکلے۔

سارے عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایلی نے گود میں پڑی ہوئی گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ ”یہ مجیں نے کیا کر دیا پھر اسے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ کرلو میرا کیا کر سکتے ہو۔ کرلو میرا کیا کر سکتے ہو ہو۔“ کوئی اس کا منہ چڑھا رہی تھی۔

غضے سے ایلی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اس ریشمی گٹھڑی پر پل پڑا۔

اگلے روز جب وہ جنگلے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو یچے زینے سے شور بلند ہوا۔ روجو شیم کوئی ہے بھی اس گھر میں کہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔“

ایلی شہزادی آواز سن کر چونکا۔ وہ تو علی احمد کے گھر نہ آئی تھی۔ کبھی آتی بھی تو سال میں ایک مرتبہ۔ لیکن اس طرح گھروالوں کو آوازیں دے رہی تھی جیسے روز کی آنے والی ہوئے اور پھر اس کی آواز اسی طرح گھنٹی کی طرح نہ رہی تھی جیسے ٹن جوں کا توں قائم ہو۔ بات کا انداز بھی ہی تھا۔ جیسے ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔

”ہی ہی ہی“ علی احمد ہستے ہوئے اگے بڑھے۔ ”لو“ وہ بولے ”ہماری قسمت مفت میں جاؤ گا اُنھی۔“

”کس نے جگادی آپ کی قسمت“ راجونے پوچھا۔

”وکیکہ ایشہزادی آئی ہے ہمارے گھر۔“

”اب تو آئے گی ہی۔“

”کیوں“ علی احمد بولے۔

”اب سودا بک گیا۔“ شہزاد چلائی ”اب خطرہ کیما۔“

”ابھی تو گودام بھرے ہیں۔“ علی احمد بولے۔ ”کیوں نصیر کی ماں ٹھیک ہے

۔۔۔“

”تم آپس میں ہی فیصلہ کر لو۔“ راجونے لگی۔

”جبھی تو میں آئی ہوں۔“ شہزاد نے کہا۔ ”میں نے کہا آج روپر و فیصلہ ہو جائے۔“

”تو آؤ بیٹھو۔ ہمارے پاس تو کبھی ہی نہیں تو۔ بس کھڑکیوں پر چیل کی طرح منڈلاتی رہتی ہے۔“

کبھی ہمیں بھی موقع دیا ہوتا۔ ہی ہی ہی، علی احمد ہٹنے لگے۔

”جسے سدھ بدهی نہ ہوا سے کیا موقع دینا، وہ ہنسی۔

”اب آئے گی بھی اندر یا ان کی باتوں میں ابھی رہو گی۔“ اندر سے راجبو لی۔

”آتی ہوں۔ یہاں تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔“

علیٰ احمد ہٹنے لگے ”بھی بڑی تیز ہے یہ شہزاد۔“

”ابھی کیا دیکھا ہے۔“ وہ اندر جانے کی بجائے سیدھی ایلی کی طرف آتے ہوئے بولی اور بے پرواہی سے ہر بیل تذکرہ ایلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ”تو یہ کیا پڑھنے کی جگہ ہے۔ اور یہ وقت پڑھنے کا ہے۔ میرا یہ خط تو ڈال آؤ ذرا ڈاک میں۔“ شہزاد نے ایک لفاف اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ علیٰ احمد سے بولی۔ ”اے ہے مہمان آجے ہیں پچھوڑا صنع نہ رو۔ کچھ منکرو اونا شہزاد آئی ہے۔“ اُن کی گھبراہٹ دیکھ کر شہزاد مسکرائی پھر مژ کر ایلی سے کہنے لگی۔ ”یہ خط تمہارے لیے ہے کہیں ڈاک میں ڈال تو میں پڑھ جاؤں گی۔“

ایلی نے دیکھا تو لفافے پر شریف کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

لفافہ کھولا تو اندر مختصر طور پر لکھا ہوا تھا۔ ”مجھ سے آج ہی ملو میں نہ تم سے بہت باتیں کرنی ہیں وہ بیٹھک جو احاطے میں کھلتی ہے۔ اس کی تیسری کھڑکی اندر سے کھلی ہو گی کھڑکی میں اندر ناریچ پڑی ہو گی۔ اٹھالیں۔ بارہ بجے سے پہلے نہ آنا۔“

رابعہ کے چوبارے کے نیچے کی بیٹھک جس کی کھڑکیاں احاطے کے میدان میں کھلتی تھیں سال ہا سال سے بند پڑی تھی۔ اسکیں گھر کا کاٹھ کپار ڈھیر کیا ہوا تھا۔ رابعہ اور شہزاد کے مکان کا صدر دروازہ چھوٹی گلی میں کھلتا تھا جسے گلیاں کہتے تھے۔ لیکن یہ ڈیورڈھی مشترک تھی۔ یہاں سے چار ایک مکانات کو راستے جانے تھے۔ اس لیے صدر دروازیت کو چوری چھپے شہزاد کے گھر جانے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میدان میں کھلنے والی بیٹھک کی کھڑکیاں ان کے گھر میں داخل ہونے کا براہ راست ذریعہ تھا وہ بھی صرف اس لیے ممکن اعمال تھا کہ رابعہ ان دونوں باہر گئی ہوئی

تحتی۔ اور شہزادہ جانے کس وجہ سے اپنے چوبارے میں آگئی تھی شاید اس کی وجہ صفر رہو۔ جس کا مکان شہزادے کے چوبارے سے عین مختص تھا۔

اس رات وہ جنگل میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ گھر کے زیادہ تر لوگ اور چھٹت پر سوئے تھے۔ باہر چکن میں زینے کے پاس بائزہ کی چار پائی تھی۔ جس کے پاس ہی وہ جائے نماز پڑھنی شروع کرنے کیا پڑھ رہی تھی۔ انہی دنوں بائزہ نے دلی کے ایک بزرگ جنہیں حاجی صاحب کہتے تھے کی بیعت کر لی تھی اور نمازوں اور وظائف میں مصروف رہتی تھی۔

یچھے احاطے کے میدان میں چاندنی چینگی ہوئی تھی۔ ایسی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ چاندنی خطرناک نتائج بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ محلے میں چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ برتن نج رہے یچھے چارپائیں گھسیٹ جا رہی تھیں

دروازوں کے پشت بندہ ہو رہے تھے۔

آہستہ آہستہ محلے پر خاموشی طاری ہوئے جا رہی تھی۔ خاموشی کے وقفے لبے ہوتے جا رہے تھے پھر محلے کی مسجد سے نمازی وظائف سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ رہے تھے قدموں کی مدد ہم آوازیں آرہی تھیں شپ شپ شپ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی تھی۔ کوئی دروازہ چڑاؤں کر کے کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ چند ساعت کے بعد پھر شپ شپ شپ قدموں کی آواز آتی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جاتی اور پھر چڑاؤں ٹھک کے بعد خاموشی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

ما جھا

احاطے کے میدان کے عین درمیان میں کنویں کو منڈیر کے قریب ما جھا ڈھیر ہو رہی تھی۔ ما جھا ایک مستانی تھی۔ جو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی اور شام کے وقت محلے کے احاطے میں آ جاتی اور کنویں کی منڈیر کے قریب رات بسر کر

تی تھیں۔

ما جھا کو اپنی سدھ بدھ نہ تھی۔ اسکی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جسم پھولा ہوا تھا۔ غالباً اس کے جسم میں حیات مفتوح ہو چکی تھی۔ اگر کوئی ما جھا کے جسم پر چلکی بھرتا تو ما جھا کو قطعی طور پر احساس نہ ہوتا وہ آپ ہی آپ بیٹھی تھے مار کر بٹھنے لگتی یا پھوٹ پھوٹ کر روتی یا جھینیں مار لی رہتی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا چغم پڑا رہتا تھا۔ سر اور جسم میں جو نیں چلتی تھیں اور رات کو جاتے ہیں بیٹھے بیٹھے اس کا پیش آپ اور پا خانہ خطاب ہو جاتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ ما جھا کون ہے، ہاں اسے آئی ہے۔ کس کی بیٹی ہے اور اس کی یہ حالت کیوں ہو گئی ہے؟ کوئی کہتا کہہ امیر بیکر گھرانے سے ہے اور کشہ محبت ہے۔ محبت کی شدت کی وجہ سے دیوانی ہو گئی ہے کوئی کہتا کہ نوجوانی میں غنڈوں نے اس سے زیادتی کی اور عفت مآب لڑکی کو اس قدر صدمہ ہوا کہہ ہمیشہ کی لیے بے ہوش کھوئی تھی۔

رات کے وقت محلے کے کتے اسے چائٹے رہتے تھے پھر نہ جانے کون کتابے چاٹ گیا کہ ما جھا پیٹ سے ہو گئی۔ لوگوں نے حیرت سے ما جھا کی طرف دیکھا۔ مردوں نے نگاہیں جھکائیں عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھلیں۔ اور اس عجیب و غریب نشم کے استفسارات کرنے لگیں۔ ویرستک وہ اس ٹوہ میں لگی رہیں کہ بکار خویش ہشیار والا معاملہ تو نہیں لیکن وہاں تو سدھ بدھ ہی نہ تھی لہذا بات ختم ہو گئی۔ معینہ وقت پر بصد مشکل عورتیں اسے کمرے میں لے گھیں۔ ما جھا کہ ہاں ایک واقعی چاند سے مکھڑے والا پچھہ پیدا ہوا۔ اور چند روز زندہ رہ کر مر گیا اور ما جھا فراغت پا کر سیدھی کنوئیں کی منڈیر کے قریب جا کر ڈھیر ہو گئیں اور اسی طرح تھقہہ مارنے پیختے اور روئے میں مصروف ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر ایک روز آدمی رات کے وقت محلے میں شور مج گیا۔

اجو بہت دیر کے بعد دوکان سے واپس گھر آ گیا۔ ان دونوں کسی تھوار کی وجہ سے دوکان پر سلائی کا کام بہت زیادہ تھا۔ جب وہ احاطے کے میدان کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ ما جھا کے ڈھیر کے قریب ایک اور ڈھیر لگا ہوا ہے۔ وہ چونکر رکا۔ دوسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی۔ کون ہے؟ وہ چلایا میں پھر حرکت ہوئی۔ ایک سایہ سا بلند ہوا۔ اور تیزی سے گلی کی طرف بڑھا۔

اجو نے شور مچایا۔

اس پر محلے کی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوئیں۔

”کون ہے؟ مال چلانی پڑے۔“

”میں ہوں میں ج۔“ اجو بولा۔ ”یہاں کوئی تھا۔“

”کہاں تھا کوئی۔“ دوسری بولی۔

”یہاں ما جھا کے پاس۔“

”ہے کون ہے۔ کالے منہ والا۔“

”معلوم نہیں ماں، میں آیا تو کوئی تھا۔“ میرے سامنے بھاگ کر گیا ہے۔

اس پر محلے کے دو ایک مرد لاثین اٹھائے باہر نکل آئے اور اسے تلاش کرنے لگے۔

اوہ زعور تین ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بد دعا میں دینے لگیں۔

”نه جانے کون بے شرم ہے۔ ہئے کیا زمانہ آیا ہے۔“

”اور پھر ما جھا کے پاس ماں۔ وہ تو گندگی کا بورا ہے۔“

”ہے لڑکی یہ مردوں اندھے ہو جاتے ہیں۔“

”میں کہتی ہوں اسے پکڑ کر باندھ دو۔ اور صبح گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراو۔“

لیکن عورتوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ تلاش کے باوجود کوئی نہ ملا۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ محلے والے چونکے ہو گئے اور محلے والیوں کی دل چھپی اس

حد تک بڑھ گئی کہ جب بھی رات کے وقت کسی کی آنکھ کھلتی یا نیند نہ آتی تو وہ انٹھ کر کھڑکی سے جھانک رک میدان میں نگاہ دوڑاتی کہ ما جھا کے ڈھیر کے پاس کوئی اور ڈھیر تو نہیں پڑا۔

اجو کے اس اکشاف کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ محلے کے جوان اور عمر رسیدہ کنوارے محلے والیوں کے شہمات کا مرکز بن گئے۔ اور رات کے وقت میدان میں جانا خطرہ مول لینے کے متراوف ہو گیا۔

ہاں، میں آ گیا
گھریال نے بارہ بجائے ایلی چپ چاپ میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایلی نے اٹھ کر اپنے کھر کا جائزہ میا علی احمد کوٹھے پر چو بارے میں تھے۔ شیم اور اس کی دونوں بچیاں اندر کرے میں ہوئے ہوئے تھے۔ شیم کے خراؤں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جنگل کے باہر دلان میں ہاجرہ تھی۔ لیکن حاجرہ کے متعلق ایلی کو کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ دبے پاؤں غسل خانے میں گیا۔ باہر صحن کا جائزہ میا۔ دلال میں ہاجرہ گھڑی بنی پڑی تھی۔ اس نے بیڑھیوں کا دروازہ کھولا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چپکے سے نیچے اتر ائیچے ڈیوڑھی میں گھٹاٹوپ اندر ہمراہ تھا۔ ڈیوڑھی مشتر کہ تھی۔ ڈیوڑھی کے پیچھے چھ سات مکامات تھے وہ رک گیا دریک کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر میدان کا جائزہ لینے لگا۔

باہر نکل کر اس نے ڈیوڑھ کا دروازہ بند کیا اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کنوئیں کے منڈر کے پاس ما جھا کا ڈھیر پڑا تھا۔ جو اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔

دفعتا وہ چونکا۔ اس کا دل دھڑک سے رہ گیا۔ ما جھا سے دس فٹ کے فاصلے پر کوئی دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ ایلی کو نے میں چھپ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ

محلے کا آدمی نہ تھا۔ اس کا جسم گول مثول تھا۔ کپڑے پھٹے پرانے تھے اور رمنہ پر وحشت سی برس رہی تھی۔ یقیناً وہ شخص ما جھا کے لیے وہاں کھڑا تھا۔

پھر دفعتاً سے خیال آیا کہ وہ خود بھی وہاں کسی ما جھا کے لیے کھڑا ہے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اسی کے دل اس نامعلوم شخص کے لیے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔ وہ ما جھا کے لیے کتنا خطرہ مول لے رہا تھا اور ما جھا وہاں گندگی میں لتصڑی پڑی تھی۔ اس سے بُوآتی تھی بوجے ہوئے پنڈے کے علاوہ اسکے پاس کچھ نہ تھا۔ ایلی نے جیب سے نارج نکانی بننے دیا یا نامعلوم شخص دیوانہ وار بھاگا ایلی نے نارج گل کروی چند مہات کے لیے انتظار کیا۔ پھر وہ چھلانگیں مارتا ہوا میدان پار کر نے لگا۔ کھڑکی کے پتھر کل لگے اس نے اندر میٹے بند کر لیا۔ اور پھر نارج کی روشنی میں کاٹھ کبڑی سے بھری ہوئی بیٹھک میں دبے پاؤں چلنے لگا۔ میرھیاں چڑھنے کے بعد وہ چوبارے کی طرف بڑھا تو رابعہ کے کمرے سے شہزادے جہانگا ”تم آگئے۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ شہزادا ایک ما جھا ہے۔ اور اس سے صفر کے تھن کی بُوآ رہی ہے۔ اس کے دل کو دھپکا سا لگا۔ میں کیوں آیا ہوں۔ کیوں پھر سے اپنے آپ کو تھن میں جھونک رہا ہوں۔ اسکے دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے اندر میں جھجھک تھی۔ شہزادا اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ”تم سچ مج آ گئے ہوا یلی۔“ ”ہاں میں آ گیا۔“ وہ بولا۔

”مجھے یقین نہیں آتا۔“ ”وہ بولی۔“ میں بھتی تھی تم اب نہ آوے گے کیا واقعی تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ کیا واقعی۔“ وہ اسکے ساتھ چھٹ گئی۔ آہستہ آہستہ صفر کا تھن ختم ہوتا گیا۔ اور بوکی بجائے شہزادے وہی خوببوآنے لگی جس سے وہ بہت مانوس تھا۔

اس کا انداز وہی تھا۔ وہی حرکات۔ وہی آواز۔ وہی باتیں۔ بالکل صرف اس

کے چہرے پر وہ معصومیت نہ تھی۔ انداز میں شوٹی نہ تھی۔ اب اس تھیلی میں وہ مینڈ کنیں پھد کتا تھا۔ خدوخال میں ایک عجیب سی موہوم بے حسی آچکی تھی۔ لیکن یہ سب باقیں ضمی تھیں۔ سب سے اہم بات تھی کہ سالہا سال کی گمنامی کے بعد آج پھر اسے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اسے سورچھل کر رہی تھی۔ اور اس کے گرد خوبصورتی طرح منڈلارہی تھی۔ اور کبھی لمبی زلفیں پیار سے اس کے گالوں کو چھوڑتھیں اور رشیں ملبوسات اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے اور ناؤں کی آنکھیں اسے رکھے رہی تھیں۔ اس پیش نظر منظر کے عقب میں ایک رسیل آواز دکھبرے انداز میں کوئی دکھبر اگیت الائپ روہی تھی۔

کہیا سنگھاسن پر ہما جہان تھا۔ سامنے گوپیوں کو بھیڑ لگی ہوئی تھی۔
دور نہ جانے کہا ماجھا گراہ رہی تھی۔

اسکے بعد یہ اس کا معمول ہو گیا۔ رات کو وہ دریہ تک پڑھتا رہتا پھر یہ پہ بجا کر محلے کی آوازیں متاثر برتن الماریوں میں رکھے جاتے۔ پلنگ کھینچے جاتے دروازے بند ہوتے اور آخر نمازیوں کے قدموں کی شپ شپ جیسے ٹینکی کی چھت پوپوندیں گر رہی تھیں۔ شپ شپ چراوں ٹھنگ اور پھر خاموشی کا وقفہ شروع ہو جاتا اور پھر دو روپ ٹپ کی مدد میں آواز پھر سے سنائی دیتی قریب آتی اور پھر مدھم پڑتی جاتی اور آخر چراوں دروازہ کھلتا اور ٹھنگ سے بند ہو جاتا۔ اور خاموشی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

رات کے بارہ کے قریب گلی سے ایک سایہ ابھرتا اور پھر میدان کے کسی نہ کسی کونے میں جا کھڑا ہوتا۔
ایلی کو اس سائے سے بے حد دل چسپی ہو چکی تھی۔

دھوپ چھاؤں

ایلی کی نیت میں وہی دوزخی ابھر رہی تھی۔ وہی دھوپ چھاؤں جو غالباً بچپن ہی

سے اس کی روح میں دبکی پیٹھی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس کا کھویا ہوتخت واپس وابس مل گیا تھا۔ اور وہ پھر کسی حسینہ کا محبوب تھا۔ حسینہ نہ سہی لیکن اب بھی وہ محلیک کی محبوب تھی۔ اس کی محبوبیت کو اس کے جسم اور خداو خال سے تعلق نہ تھا۔ اس کی باتیں اس کا اندازہ اس کا کروار اس کی محبوبیت کے ضامن تھے۔ اس کے علاوہ ایسی کو رو رو کرتی تھی کہ صدر نے کس طرح اس سے دھکو کا کیا۔ کس طرح اس کا زیور چرا یا۔ کس طرح مالی مفاد کے خیال سے اسے یقون بنا یا۔ اس وقت ایسی محسوس کرتا جیسے وہ ایک رہبر ہوا ایک ایسا عاشق ہو۔ جس کا نام راجحہ اور رہیلوں جیسے پچھے عاشقوں کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہو۔

لیکن اس کی خوشی کیما تھی بھائے بھائے اسے خیال آتا کہ وہ ایک ما جھا کے فریب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی زندگی غلطیت سے بھری ہے۔ اس کی محبت و راصل جسمانی حرص۔ اور اس کی ملاقاتیں اپنی پرانی رنگینی کھو چکی ہیں۔ ان میں دو شوق نہیں۔ وہ انتخارات نہیں۔ وہ شوخی نہیں۔ اسے محبت نہیں کہا جا سکتا۔ اب وہ ایک تعلق تھا ایک بھوٹا بھداعام سا تعلق جو عورت اور مرد کے درمیان ہوتا ہے۔

پہلے اسے یہ شکایت ہوتی تھی کہ شہزادا سے قریب بجھنے سے چکچاتی ہے۔ وہ جان بو جھ کر اس سے دوڑھتی ہے۔ اور قریب ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کہاں ہوتی ہے۔ اب جب اس سے رات کی ملاقاتوں کا سلسہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اپنی محبوبیت اور رنگینی کے باوجود شہزادا ایک ما جھا ہے۔ اور وہ خود تعفن کا شیدائی۔ اس خیال پر اسے اپنے آپ سے نفرت پیدا ہوتی۔ اور وہ شہزادے نفرت کرتا اور اپنی زندگی کو ذلت بھری حماقت کے مترادف سمجھتا۔

رات کے بارہ بجتے تو ایسی میں تعفن کا شیدائی ابھرتا۔ ما جھا کی دھن اس پر جزیرے کے بڑھے کی طرح سوار ہو جاتی۔ لیکن جب وہ شہزادے کے پاس پہنچا تو تخت پر بیٹھ کر مورچھل کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہزار داستان کا کوئی شہزادہ ہو۔

اور سوتے جائے کا دلچسپ کھیل کھیل رہا ہے۔

صحح کے وقت شہزاد کھڑکی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی سے باتوں میں مصروف رہتی۔

میں نے کہا مار جی پا کھڑی کس کی راہ دیکھ رہی ہو۔“

”ہے اڑکی کیا کہہ رہی ہے تو، ماں ہونٹ پر انگلی رکھ لیتی۔

”میں نے کہا چاچی شہزاد چھپنے کے پکا ہے ہے آج۔“

پھر وہ شیم سے مخاطب ہوتی۔ ”میں نے کہا وہ اپنے علی احمد کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے۔“

”میں کیا جانوں،“ شیم جل کر کہتی ”پوچھوڑا جو مے جو اے بغل میں دبائے بیٹھی ہے۔“

”ہئے آ خرمہارا بھی تو حق ہے۔ وہ بھی۔“

”نہ بہن میں اس سونٹھ کی گانٹھ کو لے کر کیا کروں گی۔“ شیم بولی۔

اس پر علی احمد چوبارے سے نکل کر منڈیر پر آ کھڑے ہوتے۔

”کیوں بھی شہزاد،“ وہ چلاتے۔ ”اب تو ہم کو بھی کبھی کبھی یاد کر لیتی ہو۔“

”جی،“ وہ بولتی ”وقت وقت کی بات ہے۔ بر وقت کسی پر نہ آئے۔“

”ہی ہی ہی،“ علی احمد ہنتے ”لیکن چیز وہی جو برے وقت کام آئے۔“

”کام آئے تو ہے نا۔“ وہ نہ کر کھڑکی سے ٹل جاتی۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب ڈرامہ اس کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ صحح کے وقت اسے قرب اور لگاؤ کا احساس دینے کے لیے صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ جب وہ جنگلے میں بیٹھا پڑھ رہا ہوتا تو شہزاد کسی کو مخاطب کر کے پوچھتی۔

”کیوں جی کیا ہو رہا ہے۔“

ایلی جھٹ اور پر دیکھتا اور کتاب کی طرف اشارہ کرتا۔

”اوہ چھپنے وہ چلاتی“ سارا دون بس آ لوہی چھیلتی رہتی ہو۔“

ایلی کتاب بند کر کے بیٹھ جاتا۔

”لوٹی نے کہا نسب ذرا میری طرف منہ کرو تو بات کروں تم سے۔“

”اے ہے۔ نسب چیخی۔ نیمرے منہ پر کیا دھرا ہے۔ جو تم دیکھو گی۔“

”اے ہے۔ نسب چیخی۔ نیمرے منہ پر کیا دھرا ہے۔ جو تم دیکھو گی۔“

”تمہیں کیا معلوم۔ شہزاد بنسی۔“

”آخر کیلیات ہے۔ نسب اپنچھتی۔“ جو مجھ سے کرو گی۔

”بات کا کیا ہے کوئی زبان سے ٹھوڑی ہی کی جاتی ہے۔ آمنے سامنے بیٹھ جاؤ تو بات بن جاتی ہے چاہیے منہ سے نہ الو۔“

”ہے مجھے سامنے بیٹھا گرائب کیلیات بتاؤ گی۔ نسب حیرت سے چلاتی اور نہ نہ کرایلی کا بر احال ہو جاتا۔“

پھر وہ کھڑکی سے جانے لگتی تو چیخ کر کسی سے کہتی۔ ”ابھی آئی ہیں۔“

مجھ پر تھوکو

ایک روز رات کے نوبجے کے قریب جب ایلی محلے کی آوازیں سننے میں معروف تھا فتحا شہزاد کے مکان کے عقب شوروٹل بلند ہوا۔ کوئی چیخیں مار رہی تھی۔ محلے والیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہو گئیں۔

”کون ہے ماں؟“

”اے ہے وہی سکینہ ہے۔ اس شرابی کی بیوی اور کون۔“

”میں جانوں اسے پہیٹ رہا ہے۔“

”کوئی نئی بات ہے، بہن حاجاں روز پہیٹتا ہے۔ روز پہیٹتا ہے۔“

”ہے نہ جانے پھر وہ کیوں رہتی ہے شرابی کے گھر میں۔“

”پوچھو اس سے۔“

”میں جانوں ماں ایسی بھی ہوتی ہیں کئی ایک۔“

”ایسی کیسی۔“

”جنہیں ہڈیاں رڑوانے کا شوق ہوتا ہے۔“

”ہے نہیں پھوپھی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”تو تمہیں کیا معلوم کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں ایسیوں کو۔“

”سکین تو ایسی نہیں۔“

”بس تو رہنے والے میری زبان نہ کھلو۔“

میں نے کہا میں ان کی بخشی بتاری تھی مجھے کہہ رہی تی۔ جو صدر نہ پے تو بیوی کا جی نہیں لگتا کہر میں۔“

”ٹھیک تو ہے شریل جی نہیں لگائے تو کون لگائے گا۔“

”اب لڑکی یہ صدر مجھے لے چار دن کامہمان ہے جب سے اس کا گھر چھوٹا ہے۔“

”کس کام؟“

”اے ہے آہستہ بول“ ماں بولی۔ اپنی شہزادکا قب سے کہتے ہیں سپرٹ پیتا

ہے۔“

”وہ کیا ہوتی ہے ماں؟“

”اے ہوتی ہو گی کچھ۔ وہی جو مٹی کے تیل سے بنتی ہے جسے بھک سے آگ لگتی

ہے۔“

سارا کلیجہ جل چکا ہے۔

ابھی وہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ چھتی گلی سے شور سنائی دیا۔ اور پھر صدر میدان میں آ کھڑا ہوا وہ کھڑا رہا تھا اسے دیکھ کر عورتوں نے کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیئے اور دروزوں سے دیکھنے لگیں ایلی پچانگ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے صدر کے روپرو جانے سی ڈر لگتا تھا۔ شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

صفدر میدان کے درمیان کھڑا ہو کر چیخنے لگا۔ سب چل گئیں۔ وہ بولا سب چل گئیں۔ مجھے دیکھ کر سمجھی چلے جاتے ہیں۔ ”وہ رک گیا۔

پھر اس نے پتھراٹھا کر شہزادی کھڑکی پر دے مارا۔ لکھ سے آواز آئی۔ ”یہ کھڑکی بھی بند ہو گئی۔ وہ دیوانہ وار چلانے لگا۔“ اب یہ سمجھی کھلے گئی سمجھی نہیں کھلے گی۔ کھولو۔ کھولو۔ وہ چیخنے لگا۔ صرف ایک بار صرف ایک بار سب کھڑکیاں کھول دو۔ اور پھر میرے منزلہ پر تھوکو مجھے گالیاں دو۔ پچھکرو۔ خدا کے لئے وہ بیٹھ کر رونے لگا۔

عورتوں نے مردوں کو آوازیں دینا شروع کر دیا
ابھی وہ بیٹھا رہا تھا کہ محلے کے دو ایک مردمیدان میں اتر آئے۔

”صفدر،“ اجود رزی بولا۔ ”یہ کیا تماشہ دکھارتے ہے ہو؟“

”دکھاتو نہیں رہا۔“ صفدر نے جواب دیا۔ ”تماشہ بن گیا ہوں۔“

”کیوں بنتے ہو۔“

”اوہوں میں نہیں بتتا۔“ وہ بولا مجھے حالات نے بنا دیا ہے۔ تمہاری قسم بھائی صاحب وہ تماشہ بنایا ہے کہ _____ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اس نے ایک نظر اوپر کھڑکی پر ڈالی اور پھر بولا۔ نہیں نہیں میں نئے میں نہیں ہوں میں ہوش میں ہوں۔“

ایک بزرگ بولے۔

”زیادہ نہ پیا کرو۔“

پی کر ہوش میں آتا ہوں چھا۔ ویسے مردوں طرح پڑا رہتا ہوں۔ جیسے یہ ما جھا پڑی ہے۔

”جاو جاؤ۔“ اجونے کہا۔

”کہاں جاؤں،“ صفدر بولا۔ ”سب نے کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔“

”اپنے گھر جاؤ۔“

”اپنے گھر“ وہ قہقہہ مار کر بہسا۔ اپنا گھر۔ ہی ہی ہی۔“

انہوں نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور گھٹنے لگے۔

”نہیں نہیں میں ہوش میں ہوں ہوش میں ہوں تمہاری قسم“

صفدر کے جانے کے بعد محلے کی بوڑھیوں نے پھر بات شروع کر دی۔

”اے ہے کیا حالت بن گئی ہے اس کی۔“

”ماں اپنا بھی تو پیا کرتا تھا یہ“

”تو اس پینے کی بات چھوڑ واب جو دو سال میں یہ دوسرا نشہ پیا ہے۔ اس نے

All rights reserved
www.mehmoodshahid.com
2002-2010
Digitized by srujanika@gmail.com

اسے بوکھلا دیا ہے۔“

”دوسرانشہ کون حاصل ہے۔“

”اے آہستہ بات کر لی کی اگرچہ اس کی کھڑکی بند ہے پر وہ سب کچھ سن رہی ہے۔“ ماں بے شہزادی کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس رات جب ایلی شہزادی کے پاس پہنچا تو وہ غیر از معمول خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ روئی روئی ہے۔

”تم اداں کیوں ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو“ شہزادی نے آنسو پوچھ کر کہا۔

”رو تو رہی ہو۔“ وہ بولا۔

”کیوں کیا صدر کاغم ہے۔“ ایلی نے اسے طعنہ دیا۔

شہزادی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”ایلی“ وہ بولی ”مجھے اس کا طعنہ دیا کرو۔“

”کیوں کیا جھوٹ ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں سچ ہے۔“ وہ بولی ”لیکن“

”لیکن کیا؟“

”اپنی نگاہ سے گرگئی ہوں۔“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا ”کیا میر اساتھ دے کر تم لوگوں کی نگاہ سے نہیں گری تھیں۔“

”نہیں“ بولی۔

”بدنام نہیں ہوئی کیا؟“

”ہوتی ہوں۔ لیکن میں ذمیل نہیں ہوئی۔ اتنا مجھے فخر ہے کہ میں نے تمہارا ساتھ دیا۔“

”یہ کیا ذمیل ہوئی؟“ ایلی بنتے کا۔

”مجھے نہیں پتہ کیوں بد نامی کے باوجود میرگی تذمیل نہ ہوئی بلکہ میری گروں اوپھی رہی، لوگ باتیں کرتے رہے۔ بکتے رہے میں نے ذرا بھر پرواہ کی۔ لیکن چھوٹے آدمی کو منہ لگا کر ذمیل ہو گئی۔ شہزادے کے منہ سے بے ساختہ ایک دبی ہوئی پھی نکل گئی۔ ایلی حیران تھا۔ اس نے شہزادو کو ایسی بے بسی اور خود ترسی کی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

تعفن کا شیدائی

ابھی وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ احاطے کے میدان میں شور بلند ہوا ”حرمازادہ جائیگا کہاں۔“ پھر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ چاروں طرف کھڑکیاں کھل گئیں۔ بوڑھیاں چلانے لگیں۔

”کے پکڑ لیا مان۔؟“

”پتہ نہیں۔“

”اسی حرماں کو مان۔“

”اے کس کو۔“

”مکمینہ ماجھا کو پکڑے بیٹھا تھا۔“

”اے اللہ“ چاروں طرف سے شور بلند ہوا۔

مرد جوتی پکن کر باہر کی طرف بھاگے۔ عورتوں نے لاثینیں جلا کیں۔ ایک

ہنگامہ پا ہو گیا ایلی گھبرا گیا۔
”میں جاتا ہوں بے وہ بولا۔

”گھر میں سب کو پتہ چل جائیگا کہ میں موجود نہیں۔“

”پتہ چل جائے گا۔“ وہ بولی اور اس نے ایلی کی کرمیں باتھوڑاں کر اس پر ایک
چادر پھینک دی اور پھر کھڑی کھول کر ایلی کو اتنی طرح ساتھ لپٹانے کھڑی میں کھڑی
ہو گئی۔

”یہ کر رہی ہو۔“

ایلی چلایا۔

”اوہوں۔ مرد نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ شہزادے گرفت اور مضبوط کرتے
ہوئے کہا اور پھر یا آواز بلند چلانے لگی۔

”کون ہے یہ ماں؟“

”نہ جانے کون ہے“ ماں نے جواب دیا۔

”ذرادیکھو تو۔ کیوں چھاؤ دیکھا سے۔“

”کوئی باہر کا ہے۔“

نیچے سے کسی نے جواب دیا۔

سامنے چنگلے سے شیم چلائی ”شہزادیہ ساتھ کے چھٹائے کھڑی ہو۔“ شہزادہ
لگا کر ہنسی۔

”جانوں تو نہیں“ شیم نے پوچھا۔

”لوتم بھی حد کرتی ہو۔ بھلا جانوں کو بغل میں وبا نے کوئی کا جی چاہے گا۔“

میدان میں پھر شور مج گیا۔ وہ اسے لو ہے کی نال سے باندھ رہے تھے۔“

”یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے۔“ وہ چلا رہے تھے۔

”رات بھر تو یہاں تل سے بندھا رہے صحیح بات کریں گے۔“

ہر کوئی اپنا مشورہ دے رہا تھا۔

ایلی سوچ رہا تھا ایک دن وہ بھی اسی طرح پکڑا جائیگا۔ اور وہ سب اس کے منہ پر

تحویل کیں گے۔

”میں چلتا ہوں۔“ وہ بھرا کر بولا۔

”نہ جاؤ۔“ وہ بولی۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”تمہیں ڈر لگتا ہے گیا؟“ تھیں؟“

”ہاں،“ وہ بولی ”اب تو ہر بات پر ڈر لگتا ہے۔“

”اور اس وقت تو یوں ٹدر کھڑی ہو۔“

”اس وقت تم جو ہو سو ہو۔ تم ساتھ ہوا یا تو میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ کسی سے

نہیں۔“

”آہستہ بولو۔ وہ چلایا۔ کوئی سن لے گا۔“

”پڑا سن لے۔“ وہ بولی ”اس دوزخ سے نجات ملے۔“

”یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔“ ماں نے پوچھا۔

”سمیلی ہے میری“ وہ نہ بولی۔

”تیری سمیلیوں کا بھی شمار نہیں لڑکی۔“ ماں بولی۔

ایلی پھر گھبرا گیا۔ اس نے جھٹکا دیکھا پناہا تھا چھپڑا لیا اور بھاگ کر چلا آیا۔

شہزادی کی دلیری کو دیکھ کر ایلی بے حد خوش ہوتا تھا شاید اس لیے کہ اس کی

دلیری میں عجیب سی رنگینی کی جھلک ہوتی تھی یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ایلی خود بے حد

ڈر پوک واقع ہوا تھا۔ اس لیے وہ دوسروں کی دلیری سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔

لیکن کچھ دیر بعد اس دلیری کا ایلی کے دل پر عجیب سار عمل ہوتا۔ اس کے دل میں شہزاد کے متعلق عجیب و غریب شہمات پیدا ہوتے۔ شاید اس وقت جب میں شہزاد کے پاس تھا۔ شہزاد نے کسی اور کو وصیرے کمرے میں چھپا رکھا ہو۔ شاید میرے علی پورے جانے کے بعد بیٹھ کا وہی دروازہ کسی وصیرے کے لیے بھی کھلتا ہو۔ شاید بیک وقت وہ کئی ایک سے کھیل ہی ہو۔ شاید

اس کے دل میں شہمات یوں بخوبی تھے جیسے حلوائی کی دکان پر لکھیاں بخوبی تھیں۔ اس کی نکاحوں تک عجیب و غریب مناظر یوں آکھڑے ہوتے تھے جیسے وہ خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہوں۔ پھر رقابت کا دیوانے اپنی چنگل میں لے لیتا اور وہ کرب سے رُتپتا۔ یہ کرب اس حد تک شدت اختیار کر لیتا کہ ایلی کا سانس بند ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا اوسینہ پھکنے لگتا۔ شاید یہی جد برقابت محبت میں اس کے لیے تازیانہ بن جاتا۔

اس رات شہزاد کے گھر سے واپس آئے کے بعد اسے احساس رقابت کا شدید دورہ پڑ گیا۔ میدان میں سے سب لوگ جا چکے تھے۔ عورتوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں محلے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کنوئیں کی منڈیر کے پاس ماجھا کا غالیظاً ڈھیر لگا تھا۔ سامنے کی دیوار کے قریب ٹل کے ساتھ ماجھا کا جبی شیدائی بندھا ہوا تھا۔ ایلی جوش رقابت سے کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ عین اسی طرح اجنبی رے کے بندھو لئے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دفعاً ایلی کو خیال آیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اجنبی کی دیوانہ وار جدوجہد سے ایلی کو یہ شبہ گزرا کر وہ اس قید سے مخلصی پانے کے لیے جدوجہد نہیں کر رہا۔ بلکہ ماجھا کے تغفن کی لذت کا ایندھن اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنا آپ چھڑا کر اس غلطت بھرے کنوئیں میں چھلانگ لگادے۔ اگر وہ اجنبی کو کسی ایسی جگہ باندھے جہاں سے ماجھا کا قرب حاصل کرنے کا امکان نہ ہوتا

تو غالباً وہ صحیح تک چپ چاپ دیوار سے لگا کھڑا رہتا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کتنی مناسبت تھی۔ دونوں ہی ما جھا کے دیوانے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس ما جھا سے خوشبو آئی تھی۔ وہ گونگی تھی اس کے تکلم میں شوٹی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ دبے پاؤں اتر کر اس ما جھا کے دیوانے کو کھول کر آزاد کروے، لیکن پھر خیال آتا کہ وہ رسہ جو اس کے گر لپٹا ہوا تھا۔ اس کا بندھن نہ تھا۔ اس کا بندھن تو ما جھا تھی، اس کا تعفن تھا۔

چاہے کچھ بھی ہواں نے سوچا اور چپ چاپ اٹھ کر دروازہ کھول کر ٹیچے اتر گیا۔ میدان میں پیچ کرانے نے تل کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ بھاگ گیا۔ اس نے سوچا۔ ڈر کر بھاگ گیا۔ وہ واپس اور آگئیا اور بستیر پر لیٹ گیا۔ دفعتا اس کی نگاہ میدان پر پڑی۔ ما جھا کے ذمہ دار کے قریب ہی ایک اور ڈھیر اس کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

وہ پچکے سے لیٹ گیا۔ جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

دور ما جھا در، در، در کر کے کسی کتے کو دھنکا رہا تھی۔

محلے کی چپگاڈیں چیخ رہی تھیں۔ دور بہت دور کوئی گاڑی ہوتک رہی تھی۔

نہ جاؤ نہ جاؤ

ایک روز رات کے ایک بجے کے قریب شہزادی کی طرف جاتے جاتے ہوئے جب وہ ہاجرہ کی چارپائی کے قریب پہنچا تو ہاجرہ دفعتا چونک کر بیدار ہو گئی اس نے چارپائی سے ایک جست لگائی اور آ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

ہاجرہ کے جانے پر ایلی قطعی طور پر نہ گھبرایا۔ چونکہ وہ رات کو اکثر اٹھ کر پیشاب کرنے کا عادی تھا۔ بچپن ہی سے ایلی کا مسلسل الول کی شکایت تھی۔ سمجھی جانتے تھے۔ کوہ بار بار پیشاب کرنے کا عادی ہے اگر ہاجرہ نے اسے دیکھ لیا تو اس میں

گھبراہٹ کی کوئی بات نہ تھی۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایلی نے دوہرایا۔

ہاجرہ کا دل دھک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف وہ راس چھایا ہو اتھا۔

”تم ادھرنہ جاؤ لیں“ ہاجرہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”کدرہ“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”میں تمہاری منت گوتی ہوں۔“ وہ اپنی ہی دہن میں بولتی ہے۔ ویکھو میں پاؤں پڑتی ہوں۔“

”لیکن کس لیے اماں“ ایلی تفکر کر رہا۔

”بے بیٹا میری بات مان لے۔“

”آخر بات کیا ہے؟“

”مجھے انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

” حاجی صاحب نے۔“ بولی۔

”کون حاجی صاحب؟“

”نہ بیٹا، وہ بولی۔“ آہستہ بول۔ سب جاگ اٹھیں گے کیا فائدہ۔“

”لیکن اماں مجھے کچھ پتہ بھی چلے۔“

”ادھر آ۔ ادھر میں تجھے بتاؤں“ وہ اسے لمحہ کمرے میں لے گئی۔

” حاجی صاحب میرے مرشد ہیں“ وہ بولی ”وہ بڑے کامل بزرگ ہیں۔ ابھی انہوں نے مجھے جنجنھوڑ کر جگایا اور کہنے لگے ایلی ادھر جا رہا تھا۔ اسے روک لے۔

اور میں گھبرا کر جاگ پڑی اور کیا دیکھتی ہوں کہ تم کھڑے ہو۔“

ایلی قہقہہ مار کر نہس پڑا۔ ”اماں تم بھی حد کر دیتی ہو۔ وہ بولا“ کون جا رہا ہے کہاں جا رہا ہے۔ میں نے تو پیشتاب کرنے کے لئے اٹھا تھا تمہارے مرشد کو غلطی لگی

ہے۔"

"نہ نہ" ہاجرہ چلائی "ایمان کہو۔ تم نہیں جانتے۔ تمہیں معلوم نہیں۔"
"تو نہیں ہوگا۔" ایلی بولا "اب آرام سے سو جاؤ۔"

اسکے بعد دیر تک ایلی بھاگتا رہا۔ لیکن اسے شک تھا کہ ہاجرہ ابھی جاگ رہی ہے۔ اس کے مرشد نے گیا گڑ بڑ ڈال دی تھی۔ خواہ مخواہ پھر جب ہاجرہ خرائی لینے لگی تو ایلی نے دیکھا کہ تین نجی چکے تھے اور ادھر جانا بالکل بے کار تھا۔ لہذا اس نے ادھر جانے کا خیال ترک کر دیا۔
انگلے روز ہاجرہ ایلی کو فرحت کے باں لئے گئی اور ابتدائی خاطر توضع اور نتیجیں کرنے کے بعد کہنے لگیں: "ایلی میری ایک بات مان لے صرف ایک بات اس کے بعد جو جی میں آئے کرنا۔

میں کچھ نہیں کہوں گی۔ صرف ایک بات مان لے میری خاطر۔"
"کیا بات ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"ولی جا کر حاجی صاحب کی بیعت کر لے۔ بس اور کچھ نہیں۔"

"بیعت" ایلی نے حیرت سے پوچھا "وہ کیا ہوتی ہے۔"

"وہ بھی ہوتی ہے۔" وہ بولی "چاہے کچھ بھی ہو وہ تو کر لے۔"

"اماں تو بھی پا گلوں سی باتیں کرتی ہے۔" فرحت نے کہا۔

"چلو میں پا گلی سی کہی۔" ہاجرہ نے کہا۔

ایلی رضامند ہو گیا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ ویسے عام طور پر پہ وہ ہاجرہ کی بات سن کر نہ دیا کرتا تھا۔ لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ بولا "بس اتنی سی بات ہے چلو میں اس مرشد کی زیارت کر آؤں جو آدمی رات کے وقت آ کر اماں کو اٹھی سیدھی باتیں بتا کر پریشان کرتا ہے۔"

اس بات پر ہاجرہ اس قدر خوش ہوئی کہ وہ سب کچھ بھول گئی اس نے فوراً روپے

کا انظام کیا اور دوڑی جلیل کے پاس پہنچی جلیل آصفیہ کا پیٹا تھا۔ جو ہاجرہ کی سکی بہن کی لڑکی تھی۔

اب جلیل وہ جلیل نہ تھا جس سے کسی زمانے میں ایلی واقف تھا۔ جب وہ رفیق اور یوسف مل کر ان کے ہاں جایا کرتے تھے اور جلیل آنکھیں بنانہ کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا جو ان کی بیٹھک کے متصل کی گلی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ اور پھر وہ یوسف کو بنایا کرتے تھے اور وہ بنتا تھا اور بازی گروں کی طرح قلابازیاں لگاتا جسے دیکھ کر لڑکی بے حد محفوظ ہوتی تھی۔

اب جلیل کا طرز زندگی بدل چکا تھا۔ اس نے داڑھی رکھلی تھی۔ باقاعدہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ جلیل نے بھی انہی حاجی صاحب کی بیعت کر لی تھی۔ اس کی تبدیلی اس قدر حیرت انگیز تھی کہ اس کا چہرہ تک بدل گیا تھا۔ شاید ہاجرہ کا خیال تھا کہ حاجی صاحب سے بیعت کر لینے کے بعد ایلی بھی داڑھی رکھ لے گا۔ نماز پڑھنے لگے گا اور اس کی زندگی بھی یکسر بد جائے گی۔

اگلے روز جب ایلی شہراو سے ملا تو اس نے اماں کی ساری بات سنائی۔ وہ ہنسنے لگی۔

”بے چاری ہاجرہ۔“ وہ بولی اسے علم نہیں کہ ہمارا بہاکا کسی اور کامریدہ نہیں بن سکتا۔ حاجی صاحب جتنا چاہے زور لگا لیں۔ ڈھاک کے وہیں تین پات رہیں گے۔“

”لیکن یہ بیعت کیا ہوتی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھے کیا پتہ۔“ وہ بولی ہاجرہ تو مجھے بھی مجبور کر رہی تھی۔“

”کس لئے؟“

”کہ میں بھی بیعت کر لوں حاجی صاحب کی۔ مجھے سے ہاجرہ نے کہا۔ رابع نے اصرار کیا۔ رفیق نے منقیں کیں۔ ان دونوں حاجی صاحب بیٹیں آئے ہوئے تھے۔ علی

پور میں۔ اور یہ سب یوں ان کے گرد بیعت کی بھیڑ لگائے بیٹھے تھے جیسے بتا شے بٹ رہے ہوں۔“

”تو پھر تم نے کیوں نہ کی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پہلے سے ہی نہ کی ہوتی تو گریت۔“ وہ بولی۔

”پہلے سے کی ہوئی ہے تم نے۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔

”کس کی۔“

”تمہاری اور میں کی۔“ وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔ مجھے اتنا زبردست مرشد ملا ہے کہاب کسی اور کی طرف آجہ نہیں ہو سکتی۔“

دلی

اگلے روز ایلی جلیل کے ساتھ دلی روانہ ہو گیا۔

دلی میں وہ غلام احمد کے گھر ٹھہرے۔ غلام احمد ان کا عزیز تھا۔ وہ نوجوان تھا۔

خوش شکل تھا اور نگین مزاج واقع ہوا تھا۔ اسے گانے کا بہت شوق تھا۔ اور جب وہ گاتا تو اس کا چہرہ کسی انجامی جذبے سے منور ہو جاتا۔ اسے بہت سے گیت یاد تھے۔

خصوصاً ایسے گیت جن کی وہیں چلت تھیں۔ اور گاتے ہوئے سماں بندھ جاتا تھا۔

دلی پھتتے ہی جلیل نے کہا کہ وہ اسی شام حاجی صاحب کی طرف جائیں گے۔

غلام احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا ”شام کے وقت بزرگوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں کل صبح ملیں۔“

پھر وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چلو بھائی صاحب۔ آج شام کو دلی کی سیر

رہے۔

جب جلیل نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تو احمد نے ایلی کو کہنی ماری: ”کل تو بھائی صاحب آپ باقاعدہ طور پر مرید بن جائیں گے۔ پھر تو دنیا ہی بدلت جائے گی۔ آج

آخری مرتبہ ذرا آزادی سے گھوم پھر لو۔ آؤ دلی کی بائیکیاں دکھائیں تھیں۔

احمد ایلی کو لے کر چاہڑی جا پہنچا۔ پہلے تو اس نے سارے بازار کا جائزہ لیا۔ پھر باری باری چوباروں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو ایلی گھبرا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہر بیٹھا کو لوگ احمد کو بڑے پیاگ سے ملتے ہیں اور یوں باقیت کرتے ہیں جیسے مدت کی جان پیچان ہوتا وہ مطمئن ہو گیا۔

دلی کی طائفہ کو دیکھ کر ایلی بہت حیران ہوا طائفہ تو اس نے لاہور اور امرتسر میں بھی دیکھی تھیں لیکن یہاں کی بات ہی پچھا اور تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسیاں ہیں اور بازار میں کاروبار کے لئے بیٹھی ہیں۔

ان کی گفتگو نہایت سمجھیدہ تھی۔ انداز میں نمائش نام کونہ تھی بلکہ ایک عجیب سے دوستانہ اور گھریلو انداز کی آہمیت تھی۔ احمد صرف ان بیٹھکوں پر جاتا تھا جہاں محفوظ نہ گلی ہوتا کہ اطمینان سے بیٹھ کر باقیت کرنے کا موقع ملے۔ وہ ایک سے اس نے گانے کی بھی فرمائش کی۔ ان کا گنگنا ناکس قدر پیارا تھا۔ چونکہ اس وقت وہ رسمی ساز کے شور و شغب سے پاک تھا۔ وہ یوں بیٹھی گا رہی تھی جیسے کوئی گھروالی ہندیا پکاتے ہوئی گنگنا رہی ہو۔

ہو کے رہے گا

اگلے روز صح سویرے جلیل اور ایلی صاحب کی طرف چل پڑے۔

دیر تک وہ بی ماراں کی گلیوں میں گھومنتے رہے۔ آخر ایک مکان پر پہنچ کر جلیل نے دستک دی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر اکلا اور انہیں ایک کمرے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد حاجی صاحب تشریف لائے۔

ان کا قد درمیانہ تھا۔ عمر چالیس سے متوجاً۔ رنگ گندمی تھا۔ خدوخال نستعلیق تھے جسم دبلا پتلا۔ چہرے پر جلال اور دبدبے کی بجائے بے بسی اور بجز چھایا ہوتا۔ البتہ ان کی سرے سے بھری ہوئی آنکھیں بے حد منور اور نم آلو و تھیں اور ان کا سر

حرکت کر رہا تھا۔

”کیا ہے ہے ۔ حاجی صاحب؟“ ایلی نے اپنے آپ سے کہا اور اسکے دل سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب ایک انسان ہیں۔ نہ تو دیوتا ہیں اور نہ بیرونی ایک انس سے بات کی جاسکتی ہے اور ان کی بات کاٹی جاسکتی ہے۔

جلیل صاحب سے باقیں کر رہا تھا اور ایلی سوچ رہا تھا۔

جلیل سے باقیں کرنے کے بعد حاجی صاحب ایلی کی طرف متوجہ ہوئے۔

آپ کے مزان اچھے ہیں۔ اور سب طرح خیریت ہے۔ جملہ متعلقین اچھے ہیں۔ آج کل آپ کہاں ملازم ہیں؟“ ایلی نے اپنے پیسوں سوال کروالے۔ اور ایلی کہی رسمی طور پر ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔

پھر وہ حاجی کے ہمراہ جامع مسجد کی طرف چل پڑے۔

ہر چند قدم کے بعد کوئی نہ کوئی راہ گیر حاجی صاحب کو جھک کر سلام کرتا اور وہ بڑے اخلاق سے اس سے باقیں کرتے اور پھر جلد ہی رخصت طلب کر کے آگے چل پڑتے۔ انکا سر اسی طرح حرکت کر رہا تھا۔ جیسے گردن اور سر کے درمیان ایک زم تار لگا ہو جو سر کے بو جھ کی وجہ سے جھول رہا تھا۔

جامع مسجد پہنچ کر حاجی صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایلی سے کہا۔

”بھائی وضو کرو۔“

ایلی کو وضو کرتے دیکھ کر حاجی صاحب خاموش رہے۔ جلیل نے ایلی کو ٹوکا۔

”اوہ ہوں۔“ جلیل بولا۔ ایسے نہیں بلکہ ۔۔۔

حاجی صاحب نے جلیل کی بات کاٹ کر کہا۔

”نہیں کرنے دیجئے جیسے بھی یہ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔“

ایلی نے حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ عجیب پیر ہے جو احکام صادر نہیں کرتا۔ اس کی آواز اس قدر مضموم ہے۔ پیروں کی آواز تو حلق کے نچلے پر دے سے انکلاکرتی ہے اور انداز جابر انہے ہوتا ہے۔ یہ تو بڑے ملامم انداز سے بات کر رہا ہے جیسے معدودت کر رہا ہو۔ بلکہ اس کا تو تمام تر وجود جو ایک معدودت ہے۔ ایلی کو شک پڑنے لگا کہ وہ پیروں نہیں بلکہ کوئی تاجر ہے جس نے پیروی مریدی کا دھندا چلا رکھا ہے۔ پیروں کو ہونے والے مریدوں کو ڈالنے ہیں دھمکاتے ہیں۔ ایلی کو براہ راست کسی پیروں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پیروں کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ پیروں کے بارے میں بار عرب اور جلائی ہوتے ہیں اور مریدوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

بنیا تاجر

بہر حال اسے یقین ہو گیا کہ حاجی صاحب نے پیروں بننے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ خسرو کرنے کے بعد انہوں نے ایلی کو اپنے رو برو بٹھایا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کچھ پڑھنے لگے۔

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

جی فرمائیے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”آپ کی والدہ کے حکم کو بجالا رہا ہوں۔“ وہ بولے۔

”لوں لو۔“ ایلی نے سوچا۔ ”اپنے مرید کا حکم بجالا رہا ہے۔ کسی پیروں نے کبھی مرید کے متعلق ایسی بات کی ہے کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔“

”پھر بھی۔“ ایلی نے پوچھا ”اس عمل کو کیا کہتے ہیں۔“

”اے بیعت کہتے ہیں۔“

”بیعت کیا ہوتی ہے۔“

”بیعت ایک تعلق ہوتا ہے جیسے دوستی ہوتی ہے۔“

”دیکھئے۔ حاجی صاحب۔ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

اگر آپ اپنی طاقت سے مجھے نیک بنادیں تو مجھے ایسی نیکی مطلوب نہیں۔“

”کیوں۔ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں وہ نیکی چاہتا ہوں جو میرے دل سے نکلے۔ کسی کی بخششی ہوئی نہ ہو۔“
”وہ ہنسنے لگے۔“

”سبحان اللہ۔ سبحان اللہ آپ بہت سمجھدا رہیں۔“

”ارے۔“ ایلی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بالکل ہی تاجر ہے۔“

”اگر آپ اپنی نیکی اور عبادت کے زور سے مجھے اللہ سے ملا دیں۔“ ایلی نے کہا

”تو بھی مجھے منظور نہیں۔ مانا ہے تو میں اپنے زور پر ملوں گا۔ اس کے علاوہ“ وہ ابو لا
میں نہیں چاہتا کہ بدلوں۔ میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہوں۔“

”بہت اچھے۔ بہت اچھے۔“ وہ ابو لے۔ ”نہایت اچھے خیالات ہیں آپ کے

۔۔۔

”ارے۔“ ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ بالکل ہی بنی اتم کا
مرشد ہے یہ۔“

”باقی رہا تعلق کا سوال۔“ ایلی نے کہا تو ابھی میرا اور آپ کا تعلق پیدا نہیں ہوا۔
تعلق تو دل کی بات ہے جو آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتا ہے۔ اگر آپ
والدہ صاحب کا فرمان پورا کرنا چاہیں تو بسم اللہ۔“

”بہت خوب۔“ حاجی صاحب نے کہا۔ اور ازسرنو اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ
گئے۔

”ایک بات اور ہے۔ ایلی نے پھر انہیں لوگا۔“

”ہاں ہاں۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اس وقت میرے دل میں پر دگی یا حواگی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔“

حاجی صاحب نے پیار بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ چار ایک منٹ وہ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے سراٹھایا۔ ان کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھئی تھی۔ اور چھرے پر ایک عجیب قسم کی مرت پھیلی ہوئی تھی۔

وہ جلیل سے مخاطب ہوئے۔

”جلیل صاحب،“ وہ بولے۔ آپ والدہ محترمہ کو میر اسلام دیں۔ ان سے کہیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دیں گے۔ لیکن ان سے کہہ دیں کہ _____“
وہ بولے۔ ”ایلی صاحب ہمارے دوست ہیں۔ مخلص ہیں اور ہم اپنے دوست سے کوئی بات چھپا کرنا کریں گے۔“

ایلی نے پھر حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔

”معاف کیجئے گا۔ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولے۔“ چونکہ ہمارے دل میں آپ کی دوستی کی خواہش ہے لہذا اس خواہش کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آپ کا دوست سمجھتے ہیں۔ چاہے آپ کے دل میں ایسی خواہش ہو یا نہ ہو۔ آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جائیگی۔ انشاء اللہ دیکھئے نا اگر آپ کے دل میں ایسی خواہش بڑی چیز ہے ایلی صاحب۔ ہاں تو جلیل صاحب آپ والدہ محترمہ سے کہہ دیں۔ حاجی صاحب نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ان سے کہہ دیں کہ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ ہمارا مطلب ہے جس بات کا والدہ محترمہ کو ڈر رہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔ جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اسی میں بہتری ہے۔“

”اور“ حاجی صاحب نے کچھ وقفے کے بعد کہا والدہ محترمہ سے کہہ دیں کہ

ابھی وقت نہیں آیا وقت آئے گا۔ ضرور آئے گا اور بہت اچھا ہو گا۔ بہت اچھا۔ ماشاء اللہ ایلی صاحب کے خیالات بہت بلند ہیں۔ انشاء اللہ بہت اچھا ہو گا۔ گھبرا نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ایلی صاحب بہت اچھے لوگوں سے ملیں گے۔ ان کی خوشنودی حاصل ہو گی۔ انشاء اللہ۔

جادو کی مردم

اسی روز شام کے وقت وہ دو بارہ حاجی صاحب سے ملنے تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے۔

”جلیل صاحب۔ آپ آگئے۔ اچھا لیا۔ آپ نے۔ اب آپ نماز سے فارغ ہو لیں۔ جب تک میں ایلی صاحب کو دلی کی سیر کروں۔ یوں ایلی صاحب۔ آپ دلی کی سیر کریں گے۔ آئیں۔“

ایلی نے پھر حیرت سے اس عجیب و غریب پیر کی طرف دیکھا۔ وہ حقیقت اب وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ حاجی صاحب پیر، ولی یا اللہ لوک ہیں۔ اب وہ انہیں تاجر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ نہ ہی بنیا۔ اب حاجی صاحب اس کے نزدیک ایک خوش مزاج یا اخلاقی اور اخلاص سے بھر انسان تھا۔

دودوں کی چل پڑے

ایلی حیران تھا کہ یہ مخفی سرمه جشم نجیف وزن زار آدمی اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ بھلا اسے دلی کی کیا سیر کر سکتا ہے۔ دلی کی سیر تو احمد نے کرائی تھی۔ واہ واہ کیا چیزیں دکھائی تھیں۔ لیکن احمد کے ساتھ جانے میں ایک قباحت ضرور ہوئی تھی۔ احمد کا طائفہ کے ساتھ کچھ ایسا طرز عمل تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا بھڑوا ہو۔ وہ اسے اہمیت ضرور دیتی تھیں لیکن ایسی اہمیت جیسے بھڑوے کو دی جاتی ہے۔ وہ اس سے یوں بات کرتی تھیں جیسے وہ ان کا دوست نہ ہو بلکہ ہم کا رہو۔

”آپ نے دلی کی سیر کی ہے کیا۔“ حاجی صاحب نے پوچھا۔

ایلی چونکا۔ ”مجی ہاں۔“

”کون کون سی جگہ دیکھی ہے۔“ وہ بولے۔

”مجی چاواڑی میں گیا۔“

ایلی کا جواب سنگرہا جی صاحب چونکے

”خوب۔“ وہ بولے۔

”کیا آپ نے بھی چاواڑی کی سیر کی ہے۔ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”آہم تو بھائی و نیس رہا کرتے تھے۔“

”وہاں رہا کرتے تھے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کیسٹ کی دکان تھی۔ کلتے تھے میں ہید آفس تھا۔“ بھائی اور ولی میں

برانچیں تھیں۔“

”ارے۔“ ایلی چونکا۔ ”تو کیا گھانا پڑ گیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولے۔ ”بس چھوڑ دیا کار و بار۔“

”کیوں۔“ اس نے پوچھا۔

”اللہ میاں سے دوستی ہے کیا۔“

”نہیں۔“ وہ مسکراتے۔ ابھی تو معمولی جان پہچان ہوئی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”ضرور پوچھئے۔ جو جی چاہے پوچھئے۔“

”اللہ میاں کیسے ہیں۔“

”بہت پیارے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ بہت اسی پیارے۔“

”وہ تو بہت سخت ہیں۔“ ایلی نے کہا۔

حاجی صاحب مسکراتے۔ سخت ہوتے تو کیا ہم سب اس قدر بگڑے ہوئے

ہوتے۔“

ایلی کو یہ خیال کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے اس زاویے سے اللہ تعالیٰ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک عظیم، ستی تھی۔ بے نیاز بے پروا!

”ایلی صاحب۔“ وہ بولے۔ اللہ تعالیٰ سے دوستی کر کے دیکھو۔ اس قدر غلصہ دوست نہیں مل سکتا۔“

”میں اس قابل نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”قابلیت اور راہیت وہ خود عطا کرتے ہیں۔“ حاجی صاحب نے کہا۔ ”صرف ان کی دوستی کی خواہش پیدا کر جو صرف خواہش۔“

”خواہش تو خود پیدا ہوتی ہے زبردستی پیدا نہیں کی جاسکتی۔“ ایلی نے کہا۔

”تو یہ خواہش اچھی ہے مانگو۔ اللہ میاں سے یارانہ خوب صورت سے خوب صورت عورت کے یارانے سے کہیں زیادہ نہیں ہے۔“

حاجی صاحب کی باتیں عجیب تھیں۔ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اس شخص کا تخیل کس قدر نگلینے ہے۔ اس کی غمناک نگاہ میں لکھنی و سعث ہے۔

”کیا آپ نے کبھی عورت سے بھی یارانہ لگایا تھا۔“ ایلی نے پوچھا۔
”وہ مسکرانے۔“ ہاں ہاں۔“

”مجھے بتائیے۔“ ایلی بولا۔

”ہم نے ایک مرہم بنایا تھا۔“

”کیا مرہم۔“

”ہم نے بہت سی ادویات سے ایک مرہم تیار کیا اور پھر سات روز ایک وظیفہ کیا ایسے مقام پر وظیفہ کیا تھا جو لق و دق ویرانہ تھا۔ بھیجی میں سمندر کے ساحل کے پاس ایک پرانا لائنٹ ہاؤس تھا جو مسماں ہو چکا تھا۔ اس میں بیٹھ کر ہم نے وظیفہ پڑھا اور پھر مرہم مکمل ہو گیا۔ وہ وظیفہ بھی اس مرہم کا ایک جزو تھا۔

”لیکن وہ مرہم کیوں بنایا آپ نے۔“

وہ مسکرائے۔ ”بھائی نوجوان تھے۔ عورتوں کا شوق تھا۔ ان دنوں جی چاہتا تھا کہ ایسی چیز ہاتھ لے کے جس عورت سے آنکھے چار ہوں وہ دل و جان سے ہم پر شار ہو جائے۔ ان دنوں جوانی کا جوش تھا۔ روپیہ عام تھا۔ صحت ماشاء اللہ جو بن پر تھی۔

حاشق مزاج لڑکپن ہی سے تھے۔ ایلی سننے لگا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ یہ وہی صاحب ہیں جنکی بیعت کرنے کے لئے وہ علی پور سے ڈالی آیا تھا۔

”مرہم کا نامہ میں جو یہ تلاش سے ملا تھا۔“ حاجی صاحب نے پھر بیان کرنا شروع کیا۔ ”ایک ساواہ ہوتے ہیں یہ تھے ملابہت گیلانی قسم کا ساواہ ہوتا۔ اس نے ساہماں سال تپیا کی تھی لیکن گیلانی ہونے کے باوجود بڑا نوبھی آدمی تھا۔ میں نے صح شام اس کی خدمت کی تو ایک روز بولا۔“

”ارے عقل کے اندھے۔ ماں گا بھی تو کیا مانگا تو نے۔ بھگوان کے درشن مانگتا۔ یہ نہیں تو سونا بنانے کی بدھی مانگتا۔ اس سے تو یہی تھا کہ سندھ تباہی نار بخے کی رکشا کرتا۔ نار میں بڑی شکنی ہے اگر کچھ بننا ہو تو محظوظ بنتے۔ حاشق نہ بنو۔ لگن نار مانگی تو کیا مانگا۔ اپنے آپ کو جسم کرلو گے تو کیا ہوگا؟ اچھا ب جو مانگا ہے وہی پاؤ گے۔“

ایلی حیرت سے حاجی صاحب کی بات سن رہا تھا۔

”بس تو ایلی بھائی ہم نے وہ مرہم بڑی محنت سے تیار کیا۔ اس مرہم کی خاصیت یہ تھی کہ ایک ایک سالائی آنکھ میں لگا کر جس عورت کی آنکھوں سے آنکھیں ملاو۔ وہ تمہارے پیچھے چل پڑے گی۔ تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔“

”اچھا تو پھر آپ نے وہ مرہم آزمائی۔“ ایلی نے پوچھا۔
”صرف ایک بار۔“ وہ بولے۔

”اس کا اثر ہوا۔“

”ہاں۔ اس قدر اثر ہوا۔ اس قدر اثر ہوا کہ _____ وہ رک گئے۔“

”شام کا وقت تھا۔ سببی کا موسم بڑا خوشنوار تھا۔ وہ مرہم لگا کر ہم چوپائی کے ساحل پر بیٹھا تھا اس وقت ساحل کے باعینچے میں نیچ پر ایک پارسی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت تھی۔ اگرچہ نوجوان نہ تھی۔ ہم اس کے پاس جا بیٹھے اور اس تاک میں رہے کہ کب وہ ادھر دیکھے اور اس سے آنکھیں چارہوں۔

جب آنکھیں ملیں تو وہ کویا نہ میں دیکھ کر بھوچکی ہی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ گلکلی باندھ کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک تو ہمیں اس کا بہت لطف آیا۔ لیکن پھر ہم گھبرا گئے۔

”گھبرا نے کی گیا بات تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”بھائی۔“ وہ بولے کیا وہ نگاہیں جھکانے رکھنے والی عورت۔ اور کہاں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیدہ دلیری سے گلکلی باندھ کر دیکھنے والی۔ ناس کی نگاہ میں شرم تھی نہ بھینپ۔ اور پھر اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت اس میں ذرہ بھر انسانیت نہ رہی تھی۔“

ایلی بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

”بہت جلد ہم اس سے اکتا گئے۔“ انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”پھر ہم نے دیکھا کہ ایک اور ٹیار سڑک پر چل رہی ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں ملا گئیں تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اب ہو کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ اسی طرح آدھ رکھنے میں ہمارے گرد تین عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ اس پر آنے جانے والوں نے مشکوک نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک سپاہی آگیا۔ اس کے روپ وہم تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن وہ اسی طرح گلکلی باندھ کر ہماری طرف دیکھتی رہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کر دی اور ہم وہاں سے کھک آئے۔“

”پھر اسی رات ہم تھیز دیکھنے چلے گئے۔ ہمارے الگے صوفے پر دوڑ کیاں بیٹھیں

تحمیں۔ جب وقہ آیا تو ان دونوں نے مذکر دیکھا۔ ہم پہلے ہی تاک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خوب آنکھیں چار کیں۔ انگلی و ہی حالت ہوئی۔ اب وہ مستقل طور پر منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ کھیل شروع ہو گیا لیکن وہ اسی طرح سطح کی طرف پیٹھ کے بیٹھی رہیں۔ ان کے لا ہقین نے ہزار کوششیں کیں کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھیں لیکن لڑکیوں نے ان کی بات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہنگامہ ہو گیا اور ہم وہاں سے بھاگے۔

”عجیب مرہام تھا وہ۔ میں اولاً۔“

”ہم نے تو یہ محصول کیا کہ جس کی طرف ہم لے کتے تھے اس کی روح گویا شل ہو جاتی تھی اور خالی جسم وہ جاتا اور پھر اس جسم سے خوف آنے لگتا۔ نسایت تو گویا ختم ہو جاتی۔ یعنی گلب کے بجائے کدو کا پھول وہ جاتا جس میں نہ ہوتی نہ باس۔ یہ دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ طلب میں ہماگی کہ کیوں نہ ایسی طلب پیدا کریں جہاں حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالی طلب بس دھلتا۔۔۔ طبیعت نے پلا کھایا اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ سب کچھ کاروبار، شوق، تفریخ، سب کچھ۔“

کچھ دری کے لئے وہ خاموش ہو رہے پھر بولے۔

”میں صاحب یہ تو سب بہانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ ہم پر بھی کرم کر دیا انہوں نے۔ ان کی کرم نوازیاں ہیں۔“ وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دری کے بعد ہو کہنے لگے۔

”آئیے ایلی صاحب آپ کو اللہ کے بندوں سے ملائیں۔ ہمارے پاس اور کیا ہے۔ بس حاضر تو فیق والی بات ہے۔“

”بھی اچھا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

عربی مastr

”تو کن سے ملیں گے آپ عقل والوں سے یا دل والوں سے یہ ولی

تو اللہ کے بندوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک انوکھا ہے۔ ایک سے ایک نرالا ہے۔ ولی پر خدا کا ہمیشہ کرم رہا ہے۔ اس شہر سے بہت لگاؤ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کے لئے خزانوں کے منہ گھول رکھے ہیں۔ جس کی جتنی ہمت ہوا تھا لے۔ اور بھائی ہم تو ابھی مبتدی ہیں اسی مکتب میں ابھی الف کے چکر سے نہیں نکلے، ہاں تو بتائیے عالم سے ملیں گے یا۔۔۔۔۔

”جی۔ عالم سے ملائیے۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ایلی ابھی عقل کے چکر سے نہیں کل پایا تھا۔ ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ دل کے کہتے ہیں۔ اس کی دانست میں انسان کی نفیات میں صرف ووچینزیں اہم تھیں۔ عقل ذہن۔ ایلی کو یہ علم نہ تھا کہ دل کے کہتے ہیں۔ قلب کیا ہے۔ اور روح کی بلاد کا نام ہے۔

چوبارے پر چڑھتے ہوئے حاجی صاحب گئے لگے۔ ”جن صاحب سے آپ کو ملنے جا رہے ہیں ان کا نام محمد حسین ہے۔ عمر بھر عربی پڑھاتے رہے ہیں۔ ماشاء اللہ۔“

”عربی ماشر!“ ایلی کے ذہن میں تھارت کی ایک رو دوڑگی۔ عربی ماشر بھلا کیا جالم ہوگا۔ انہیں تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ عربی ماشروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ حلق کے نچلے پردوں سے بات کرتے۔ بار بار لاحول پڑھتے اور تہذیب جدید کی ہربات پر ناک بھوں چھڑھاتے تھے۔ اسکے علاوہ انہیں انگریزی زبان سے چڑھی۔ جسے انگریزی زبان سے چڑھو وہ کیا جالم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔

ایک مختصر سی بیٹھ کیا تھا۔ اس کا فرش ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں کئی ایک ٹھیک کتابیں پڑی تھیں۔ ان کے درمیان چار ایک ڈیک نما چوکیاں رکھی تھیں۔ ایک ایسی ہی چوکی کے پاس ایک دوسرے بدن کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سادہ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ کھدر کا لمبا چغہ اور پا جامہ۔ سامنے چار ایک لوگ

بڑے احترام سے بیٹھے تھے۔

ماستر صاحب جملہ لوگوں سے مخاطب تھے۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھی کہ ہر چیز میں ہونا اور پھر واحد ہونا دونوں یک وقت غیر ازامگان نہیں۔

وہ بڑی روانی سے اردو بولنے ہے تھے ایلی کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کئے بغیر اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایلی غور سے ان کی بات سنتا رہا لیکن اسے خاک سمجھنہ آیا۔ چونکہ وہ ان الفاظ اور اصطلاحات سے قطعی ناواقف تھا۔ البتہ ایلی پر محمد حسین کی شخصیت نے خاصاً اثر کیا۔ ان کی طبیعت میں سادگی تھی۔ ان کی باتیں جذبہ سے سرشار تھیں اور ان کا انداز دوستانہ تھا۔

جب وہ جزو اور گل کا مسئلہ تجھا بچے تو ہمیں نے جو پہلے ہی اثر اور احترام سے بھیکے بیٹھے تھے اجازت حاصل کی اور رخصت ہو گئے۔

اس وقت مولانا نے حاجی صاحب کو دیکھا۔ بڑی تعظیم سے انہیں ملے۔ ایلی سے شفقت بھرا مصافحہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ایک منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو اصحاب آگئے آتے ہی کہنے لگے۔

”مولانا۔ ایک مشکل درپیش ہے۔ امداد کے لئے حضور کی طرف رجوع کیا ہے۔“

”کہیے کہیے۔ مولانا نے بے تکلفی سے کہا۔

”گستاخی معاف۔“ وہی صاحب بولے۔

”شوق سے پوچھو میاں۔ جو جی میں آئے پوچھو۔ جو جی میں آئے کہو۔ اگر ہماری دانست میں بات آئی۔ تو بیان کر دیں گے۔ صحت کے ضامن نہیں اپنا اپنا خیال ہے۔ میاں اپنی اپنی رائے ہے۔ علم تو وہ سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں اور ہم تو میاں ابھی کنارے پر بیٹھے ہیں۔ علم کی تو ہوا بھی نہیں گلی۔ ہاں ہاں شوق سے کہو۔“

”سوال یہ ہے حضور مولانا کہ گوکا کیا ذائقہ ہے۔“

ایک ساعت کے لیے مولانا نے سر جھکا لیا۔ خاموش پیٹھے رہے۔ پھر سرا اٹھا کر
مسکرانے لگے بولے۔

”میاں ہمارا اندازہ ہے کہ گوکے تین ذائقے ہوتے ہیں۔“

”تعین ذاتے“، میں حیرت سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پہلے اس میں مٹھاں ہوتی ہے۔ پھر وہ کٹھاں سے بھر جاتا ہے اور بالا آخ زہر بن جاتا ہے۔

سن لیجئے کہ ہمارے المذاہبے کی بنیادیں کیا ہیں۔ پہلی حالت میں اس پر مکھی پیٹھتی ہے اور مکھی ہمیشہ مٹھاں پر پیٹھتی ہے نہ سفلی پڑتی ہے نہ چیوٹی منہ لگاتی ہے نہ کوئی اور جانور تو ظاہر ہوا کیسری حالت میں وہ زبرہ، ہو جاتا ہے۔“
اس پر واہ واہ سبحان اللہ کا شور عجیباً۔

ابھی وہ دونوں اصحاب جو گوکے ذائقے کے متعلق پوچھنے آئے تھے اجازت حاصل کر رہے تھے کہ چھسات لوگ اور آگے۔ انہوں نے آتے ہی ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا۔

ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے۔

”مولانا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اجمیر شریف کے گز شستہ عرس میں ہم آپ کو اجمیر شریف میں ملے تھے۔ اس روز جمعرات کا روز تھا۔ آپ ہمیں اس حجرے میں لے گئے تھے۔ جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے اور شاید آپ کو یاد ہو کہ آپ نے ہمیں مسئلہ ارتقاء سمجھا تھا۔“

شاید مولانا بولے ہمیں یاد نہیں۔ خیر آپ بات سمجھئے۔“

اس کے بعد ایک اور صاحب بولے۔ کہنے لگے:

”مولانا۔ عرس کے روز ہم دلی میں آپ سے ملے تھے۔ اسی ویران خانے میں۔ بلکہ باتوں باتوں میں آپ اچھیر شریف کا ذکر کیا تھا۔“

”اب سوال یہ ہے کہ۔“ ایک اور صاحب کہنے لگے۔ ”کیا یہ ممکن ہے مولانا کہ ایک شخص بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو یہ فرمائیے کہ ایسے صاحب کا روحاںی طور پر کیا مرتبہ ہو گا۔“

مولانا ہنسنے لگے۔ کچھ دیر کے تو قف کے بعد بولے۔ روحاںی طور پر اچھے مرتبے اور مقام والے اصحاب گلیئے عین ممکن ہے کہ وہ بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہوں۔ سبحان اللہ کیا مرتبہ ہے۔ وہ رک گئے۔

”آخر بی ما شر ہے تا۔“ ایلی نے سوچا۔ خودستائی سے کیسے بخ ہلتا تھا۔“ کچھ تو قف کے بعد مولانا نے کہا ”جذب ٹھانی، ایک شرط لازم ہے اس سلسلے میں، وہ یہ کہ بیک وقت دو مقامات پر حاضر ہونے والے صاحب کو یہ احساس ہو کہ وہ بیک وقت دو مقامات پر موجود ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں یہ شعور ہے کہ ہم اس روز دلی میں موجود تھے اب گیر شریف کی حاضری کا نہ ہمیں شعور ہے نہ احساس نہ علم لہذا امر تبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

پہلے دواؤ میوں نے اس پر شور مچا دیا۔ بولے ”حضرت ہم نے تو بے قائمی ہوش و حواس آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی ہے آپ نے ہم سے گفتگو فرمائی ہے۔“

بالکل بالکل۔ مولانا نے کہا۔ ہم آپ کی بات جھیلاتے نہیں۔ یقیناً آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ نے ضرور ہم سے ملاقات کی ہو گی۔“

”تو پھر تو پھر۔ انہوں نے شور مچا دیا۔

”میاں۔“ وہ بولے وہ قادر مطلق بہت بڑا شعبدہ باز ہے۔ اگر ہو چاہے کہ کوئی فرد دو جگہ موجود کھائی دے تو یہ اس کی شعبدہ بازی ہے۔ البتہ اگر ہم ازاں اپنی مرضی سے اور ارادے سے دو جگہوں پر موجود ہوتے اور ہمیں اس امر کا شعور ہوتا تو اور بات تھی۔ کیوں حاجی صاحب؟“ انہوں نے حاجی صاحب سے اپوچھا۔

”آپ بہتر جانتے ہیں۔“ حاجی صاحب بولے۔

پیلی بائی

حاجی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ایلی گھر آ کر پڑ رہا۔ اس روز وہ عجیب خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ حاجی صاحب کی دنیا عجیب دنیا تھی۔ وہ مرہم و عالم اور نجانے کیا کیا محسوس کرنے لگا تھا جیسے حاجی صاحب کی دنیا ایک وسیع دنیا ہو جس کا صرف ایک کونہ اس نے دیکھا تھا۔ کیا وہ عربی ماشر واقعی ووجہوں پر بیک وقت موجود تھا یا وہ محض ایک دھونگ تھا۔ کیا کو کاذا لقت اس نے عقل کے زور پر بتایا تھا۔ بہر حال وہ حیران تھا۔ اس کے دو برادر ہی عربی مولوی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا اپنا مرشد برٹش رسل مودبانہ مولوی کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی داستور و سکی، برنا روڈشا، اسچ جی ویز، کافکا، سلمہ لکراف، جینز، سب مودبانہ بیٹھے تھے۔ اور مولوی انہیں سمجھا رہا تھا۔

میاں وہ کہہ رہا تھا۔ تمہیں اللہ کی دین حاصل ہے لیکن تمہیں اللہ کی دین کا احساس نہیں۔ اپنے علم میں اللہ کو بھی شامل کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

کونے میں فرائد مشتبہ نگاہوں سے مولانا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مانگرو سکوپ تھی جسے وہ بار بار لگاتا اور یوں مولانا کی طرف دیکھتا جیسے کسی جراثیمہ پر تحقیق کر رہا ہو۔

اگلے روز وہ شام کو علی پور جانے والے تھے۔ وہ پھر کو احمد بولا۔ ”ایلی صاحب چلے آپ کو پیلی بائی سے ملا لاو۔ بڑے غصب کی چیز ہے۔“

جب وہ دونوں پیلی بائی کے چوبارے پر پہنچ تو وہ میلے کھیلے کپڑے پہنے کھڑکی میں فرش پہنچی تھی۔

”آؤ احمد۔“ وہ بے تکلفانہ انداز سے بولی۔ بڑی دیر کے بعد آئے ہیں

آپ۔“

احمد نے آداب عرض کی اور اس کے پاس جا بیٹھا۔

”تشریف رکھنے نا۔“ وہ ایلی سے کہنے لگی۔

ایلی چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔

”یہ کون صاحب ہیں۔ اس نے احمد سے اپوچھا۔

”یہ میرے بھائی ہیں۔ الیاس آ صفائی۔“

”الیاس صاحب۔ وہ بولی۔“ میں نے آپ کل تصویر کہیں دیکھی ہے۔“

یہ تو خود تصویر ہیں۔ ان کی تصویر کیا ہو گی۔ احمد بولا۔

”کیا مطلب۔“

”میو لئے نہیں تصویر بن گر بیٹھ رہتے ہیں۔ احمد نے قہقہہ مارا۔

”جنہیں دیکھنا ہوا ہے بولے نہیں۔ ایلی نے بند مشکل ایک بھر کیلی بات کی۔

”ارے۔ وہ بنسی ہو آپ دیکھتے ہیں۔“

”جی۔“ ایلی نے باالی پر بھر پور نگاہ ڈالی۔

”دیکھنا تو اچھی چیز نہیں۔“ وہ بولی۔ خواہ مخواہ خطرہ مول لیا۔ وہ مسکرائی۔ اس

سے تو دکھنا کہیں اچھا ہے۔

تو جبھی آپ دیکھتی نہیں۔“ احمد ہنسنے لگا۔

”ہمارا کیا ہے۔“ اس نے ایک آپ بھری۔ ہماری طرف سمجھی دیکھتے ہیں اور کوئی بھی نہیں دیکھتا۔ اور اپنی یہ حالت ہے کہ بت کہیں چت کہیں۔“

”تو آپ بیک وقت دو جگہ ہوتی ہے۔ ایلی نے کہا۔

وہ بنسی۔ ایک جگہ رہیں تو جیون کیسے کئے۔ اور یہ جو روپ ہے یہ تو نقلی ہے۔“

”اور اصل چیز کتنی میں بامدھ کر رکھی ہے۔ احمد ہنسا۔

”انہوں۔“ وہ بولی۔ ”اصلی چیز خاک میں مل چکی ہے۔“

”خاک میں مل کر رہی تو سون بنتا ہے۔“ ایلی نے ایک اور نمائشی فقرہ چست کیا۔
”بنتا ہوگا۔ ہم تو مٹی بن کر رہ گئے۔“

”اے تو بیٹھی کیا کر رہی ہے پیلی۔“ اس کی ماں نے غصے سے ادھر دیکھا۔ ”اٹھ اب تیار ہو۔“

”بیٹھ لینے والے ماں۔“ وہ بولی بیٹھ لینے والے پچھو دیر اور۔ ساری عمر تیار رہی ہونا ہےنا۔“

پیلی کے انداز کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے مولا نا پیلی کا ہیس بنا کر بیٹھے ہوں۔ یہ باتی حقیقت سے کم قدر قریب ہے۔ دو یہ دیکھنے میں کس قدر دوڑ۔ یہ حقیقت کیا چیز تھی۔ اسے یہ بھروسہ میں نہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود واسی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ حقیقت ایلی کے لئے وہ مقام تھا جہاں سے ہر چیز اپنی تمامت عربیانی میں پورے طور پر دکھائی دیتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں پیلی کے پاس بیٹھے رہے۔ احمد کونہ جانے کیا سمجھی وہ نیچے جا کر بہت سے چلغوزے لے آیا اور وہ تینوں بچوں کی طرح چلغوزے کھاتے رہے۔ احمد نے بہت سے چلغوزوں کے مفرز نکال کر پیلی کو پیش کیے۔

”اوہ ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”خود تو ڈر کر کھانے میں مزہ ہے احمد۔ مفرز ندو مجھے چلغوزے کھانے کا سارا رومان ختم ہو جاتا ہے۔“

”اپ کو رومان سے دل چھپی ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن ہمارے لئے رومان کچھ اور چیز ہے۔ یہ رومان نہیں۔ اس کی حقیقت ہم پر اس حد تک آشکار ہو چکی ہے کہ کسی گنتی شمار میں ہی نہیں رہا۔“ ”ہمیں بھی پتہ چلتے۔“ ایلی بولا۔

”اوہ ہوں۔“ وہ مسکرائی ”چل بھی جائے تو بھی نہ چلے گا۔ آپ کی دنیا اور ہے ہماری اور۔ آپ دیکھتے ہیں اور ہم پر دکھنا لازم ہے۔ رہا دیکھنا تو میں دیکھ دیکھ کر اکتا

گئی ہوں۔ پھر بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کر لوں پھر بھی دکھتا ہے۔“

اس کی بات سن کر ایلی خاموش ہو گیا۔ اسے کوئی بات نہ سوچھ رہی تھی۔

”وہ دھن کیسے ہے۔“ احمد نے کہا۔ ”مکھ موز موڑ مکات جات۔“

اور وہ گانے لگی۔ اس کے چہرے کا عالم ہی بدل گیا۔ پہلے اس پر بے نیازی کی دینیزتہ چھپی ہوئی تھی۔ جمال اور بے نیازی جس میں تصنیع نہ تھا لیکن جو نہیں اس نے آہستہ آواز میں گانا شروع کیا ہے نیازی ختم ہو گئی۔ میک مہمنہ پا ایک دل فریبی جیسے دھن محبوبیت کی وہ کیفیت ختم ہو گئی ہو۔ جو خود بخوبی دبلا جدوجہد بغیر خواہش اور کوشش کے چھائے ہوئے تھی۔ اب وہ محبوبیت پیدا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ دونوں کیفیات میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ خدا بی شکن تھی۔ بے نیاز لا شوری محبوبیت سے مر شار۔ اب نہ جانے کیا بن گیا ہے۔ کیا واقعی خواہش بذات خود محبوبیت کی کاٹ تھی۔

مہارانی

علی پور آتے ہوئے راستے میں ایلی ولی کے تاثرات میں مر شار رہا لیکن علی پور پہنچ کر جب وہ پہلے روز شہزادے ملاؤ وہ تاثرات سب کے سب یوں کافور ہو گئے جیسے صبح کی وہند سورج کی شعاعوں سے صابوں کے بلبوں کی طرح اڑ جاتی ہے۔

”ہمارے مرشد ہی کسی کے مریدین آئے تو اب ہمارا کیا ہو گا۔“ شہزادے نے کہا۔ ”ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہ رہی نا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم مہارانی ہو۔“ وہ بولا۔ اور مہارانی مہارانی ہی ہوتی ہے۔“

”جب مہاراج ہی بھکشو ہو جائیں تو مہارانی کہاں رہی۔“

”جسے تم ساخ زانہ ملا ہوا ہو وہ بھلا بھکشو کیوں بنے۔ بھکشو تو وہ بنتا ہے جس کے ہاتھ پلے کچھ نہ ہو۔“

”ہاں تو پھر حاجی صاحب نے کیا کہا۔ مجھے سب کچھ بتاؤ نا۔ شہزادہ اس کے

قریب تر ہو گئی۔

حاجی صاحب نے کہا۔ ”اس کا مرشد بہت زبردست ہے۔ اس کو سنبھالنا اپنے
بس کاروگ نہیں۔“

”جع۔“

”تمہاری قسم۔ وہ دبلا پلا حاجی چاہے کچھ بھی ہے لیکن صاحب نظر ضرور ہے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔ صاحب نظر۔“

”اس نے مجھے دلکش کر تھا میں طبقتوں کا اندازہ لگایا ہے مجھ میں تمہارا پروڈیکٹ
لیا۔“

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ شہزادو کو سب بیخوبی تباہ کرنے والے۔ وہ پیغام جو حاجی صاحب نے
اماں کو دیا تھا _____ ”ہو کے رہے گا۔“ ایلی کے دل میں کوئی چلا رہا تھا۔ ”ہو کے
رہے گا۔“ اس کی زبان پر باار بار آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادو
کو اس راز سے آگاہ کرے۔ شاید اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ شہزادو اسے رد کر دے
گی۔ جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ بہر صورت اس نے بات پھر سے چھیڑی۔ بولا۔

”شہزادا ایک بات کہو۔“

”کہو۔“ وہ بولی۔

”اس طرح کیسے زندگی بسر ہو گی۔“

”کس طرح۔“ اس نے پوچھا۔

”اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے انجام کیا ہو گا۔“

”انجام تو ہو چکا۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تمہیں کھو کر پالیا۔“

”لیکن میں نے تو تمہیں نہیں پایا۔“

”تم نے کھویا ہی نہیں تھا۔ پھر پانے کا کیا سوال ہے۔“

”نہیں شہزادو۔ ہماری زندگی ایک ڈھونگ ہے۔ ایک مسلسل جھوٹ۔ فریب۔“

ہم دوسروں کو دھوکا نہیں دے رہے ہے۔ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ خود فریب کھار ہے ہیں۔“

”فریب ہی سہی۔“ وہ بولی۔ ”مجھے یہ فریب کھانے ہی دو۔ اتنی زندگی بیت گئی ہے۔ اب باقی رہا کیا ہے۔“

”نہیں شہزاد۔“ وہ بولا چلو کہیں چلے جائیں۔ اب بھی وقت ہے۔“

”میری طرف دیکھو۔“ وہ بولی۔

ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہے؟“

”دیکھا۔“ وہ بولی ”کیا اب بھی یقین نہیں المیں چھپوں کی ماں ہوں۔ چھپوں کی۔“

”تو پھر؟“

”اپنی زندگی تو میں نے تباہ کر لی۔ اب تمہاری زندگی تباہ کیسے کروں۔“

”اس طرح تو بہت آباد ہے۔“ وہ بولا۔

”تم شادی کرالو ایلی۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”میں یہ بخوبی برداشت کر لوں گی۔“

”تو پھر بات کیا بی۔“

”بس تم مجھ سے الگ نہ ہونا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔“

”نہیں شہزاد۔“ وہ بولا ”یہ ہو کے رہے گا۔“

”کیا ہو کے رہے گا۔“

”ہم ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔“

”وہ تو ہم ہیں ہی۔“ وہ بولی۔

”اعلانیہ ہو کے رہیں گے۔“

وہ قہقہہ مار کر ہٹنے لگی۔ اعلانیہ ہی تو ہیں۔ سمجھی جانتے ہیں۔ خود شریف جانتا ہے۔

”شریف جانتا ہے۔“ ایلی نے دو ہر لیا۔

”ہاں۔ وہ صدر کے متعلق مجھے طعنے دیتا تھا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا طعنہ دینا ہے مجھے تو ایلی کا دو۔ اس شرایی اور کمینے کا طعنہ نہ دو۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔“

”اوروہ؟“
”وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“ وہ بولی۔ ”کوئی بات نہیں کی۔ مجھے معلوم نہیں ایلی کہ میں کس لئے تمہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔“
”اوروہ؟“

”وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“ وہ بولی۔ ”کوئی بات نہیں کی۔ مجھے خود معلوم نہیں ایلی کہ میں کس لئے تمہاری ہو گئی۔ تمہارے پاس دھن نہیں۔ دولت نہیں۔ خوب صورتی نہیں۔“

”خوب صورت تو میں ہوں۔“ وہ ہٹنے لگا۔

”آئینہ دکھاؤں۔ نہ تم بچے ہونے جوان ہو۔ نہ جانے کیا ہوت۔ مجھے جسمانی ہوس نہیں تم سے۔ کچھ بھی نہیں پھر بھی تمہاری ہو چکی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں کبھی نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ شک سے دیکھتے رہے۔ پھر بھی۔“ اس کی چکلی انکل گئی۔

ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شہزاد پیلی باٹی ہو۔ جس نے کہا تھا ”سب ہمیں دیکھتے ہیں لیکن دیکھتا کوئی بھی نہیں“، شہزاد کو محلے کے سب جوان بوڑھے دیکھتے تھے۔ لیکن شاید اسے کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی پیلی باٹی کی طرح ہر وقت دو جگہ موجود رہتی۔ قریب ہو کر دور رہتی۔ دور ہوتے ہوئے اس قدر قریب آ جاتی۔

اس کی دوڑتھی کو ایلی نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ ایلی کے لئے ایک معتمہ تھی۔ اس میں ما جھا پیلی بائی دیوی مہارانی اور نہ جانے کون کون بر اجمن تھیں۔

چھٹیاں ختم ہونے پر جب وہ آخری مرتبہ شہزادے ماتاؤں نے پھر سے تذکرہ

چھپیرا۔

”چلو شہزادے۔ کہیں چلے جائیں۔“

لیکن شہزادے اس کی بات نہ سنی۔ ”اب کہاں جانا ہے۔“ وہ بولی پھر اس نے بات کا موضوع بدل دیا۔

بنو گورابنوا

ایلی کا تباولہ ڈیرہ میں ہو چکا تھا۔ اس کے اس تباولہ پر سب حیران تھے۔ رامپور سے جلد مخلصی پالینا حیرانی کی بات تھی۔ رام پور دور دراز مقام پر آبا و تھا۔ دریائے سندھ کے اس پار چہاں جاتے جاتے دو دن لگ جاتے تھے۔ اگرچہ جگہ نہایت اچھی تھی اور وہاں کا ہیئت ماضتو دیوتا خصلت کا ایک ہندو تھا۔ اس کے علاوہ رام پور کا سکول بے حد خوب صورت تھا۔ اس کے ساتھ ماحقہ زمین بہت وسیع و عریض تھی جس پر با قاعدہ کھیتی باڑی کی جاتی اور اس کی آمدی اس قدر ہوتی تھی کہ سکول میں غربا کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بلکہ ان کی کتابیں اور کپڑے بھی اس فنڈ سے دیئے جاتے تھے۔ اور بورڈنگ میں جو کھانا پکتا تھا وہ بھی اسی فنڈ سے پکایا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس سکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ایک تو تعلیم، دوسرا کھانا کپڑے اور کتابوں پر کوئی خرچ نہ اٹھتا تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ کئی ایک اور ضروریات کیلئے امداد ملتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود اس امتہ وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔ اس کی وجہ رام پور کی دوسری تھی۔

جب ایلی رام پور سے بدل کر ڈیرہ آیا تو چار ایک دن کے بعد جمیل آدھما۔

جمیل ڈیرہ کے شیشیں پر ملازمت کر چکا تھا اور شہر کے بیشتر لوگ اس سے واقف تھے۔

جمیل نے آتے ہی شور مچا دیا۔

”تو ایلی صاحب ڈیرہ میں تبدیلی ہو گئے ہیں۔ کاش کہ میں بھی ڈیرہ میں ہوتا۔

مگر کچھ پرانیں۔ خان پور سے کچھ زیادہ دوڑنیں۔“

ایلی ہنسنے لگا۔ ”یہذا اچھا ہے۔“

”سب معلوم ہو جائے گا۔“ جمیل چلانے لگا۔ وہ اچھا ہو گا وہ اچھا ہو گا۔

برخوردار کے کچھ میں آجائے گا تم کو۔ بڑا فی خان بننا پھرتا ہے۔ عزت والا گنا جاتا ہے۔ اور ہم، ہم کو لوگ رویلیں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تو ہم سب کا پیغام مرشد ہے۔ لیکن ایسا فریب دے رکھا ہے لوگوں کو کہ وہ مجھے باعزالت سمجھتے ہیں۔ اچھا یہاں _____ تو بھی یاد کرے گا۔“

ایلی نے حیرت سے جمیل کی طرف دیکھا۔ جمیل نے تو اس سے کبھی ایسی باتیں نہ کی تھیں۔

”ارے۔“ دفعتا اسے خیال آیا۔ گونگے کو زبان ملی ہوئی ہے۔ یار نے پی رکھی ہے۔“

”ہاں پی رکھی ہے۔“ جمیل بولا۔ ”پھر تمہیں کیا تکلیف ہے سالے۔ لوگوں کو کیا تکلیف کھل ہے۔ ہم جو جی چاہے کریں۔ کوئی ہے سالہ جو پوچھنے کی جرات رکھتا ہو۔“ شام کو سیر کے بہانے جمیل اسے شہر لے گیا۔ ایلی چونکہ نووار دھما۔ وہ شہر سے واقف نہ تھا لہذا جمیل کے ساتھ ساتھ چلے گیا۔

”ارے۔“ دفعتا ایلی چونکا۔ شہر کے لڑکے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ ارے دیکھ وہ ماشر جی جا رہے ہیں۔ ایک ساعت کے لئے وہ چونکا۔ پھر اپنی طبعی بے نیازی کی وجہ سے سب بھول گیا۔ دفعتا اس نے دیکھا کہ وہ چلکے میں کھڑا ہے۔

”ارے۔“ وہ چلایا۔ ”یہ کہاں لے آئے ہو مجھے۔“

”اُبھی دیکھو۔“ جمیل بولا۔ ”آج ڈیرے کے بچے پچھے کوپتہ چل جائے گا کتو شرابی اور رنڈی باز ہے اور گل وہ سکول میں تیرانداق اڑائیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔
وہ ہنسنے لگا۔

پھر جمیل اسے باری باری ہر چوبارے پر لے گیا اور بڑے اہتمام سے اس نے باسیوں سے اس کا تعارف کرایا:

”یہ الیاس آصفی ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اور یہاں گونجھ سکول میں ماشر ہے۔“

وہ سب کی سب جمیل کے ڈیرے سے تباہ لے پر افسوس کا اظہار کرتیں تو وہ چلا کر کہتا۔

”یہ ایلی جو یہاں ہے۔ بس مجھے لوئیں یہاں ہوں۔ میری جگہ یہ حاضری دیا کرے گا۔ کوئی کام ہو سیدھی سکول چلی جانا اور الیاس آصفی کا پوچھ لینا۔“

ایلی سخت گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا مگر جمیل کے سامنے بے لس تھا۔

آخر کار جمیل ایلی کو لے کر ایک چوبارے میں جا پہنچا۔

”یہ گھر میرا خاص گھر ہے۔ وہ بولا۔

”ان کے مجھ سے پرانے مراسم ہیں۔ آئندھیں ملاؤں۔ ہاں بھی حساب سے کھڑی ہو جاؤ۔

یہ ہے سب سے بڑی بنو۔ اور یہ بخشی گوری اور یہ چھوٹی بنو۔ بیٹھ جاؤ۔ اب سب بیٹھ جاؤ۔“

وہ عنیوں بیٹھ گئیں۔

اتھے میں باہر سے کسی نے آواز دی اور وہ خوش پوش پٹھان داخل ہوئے۔
”اُرے بھئی۔“

جمیل انہیں دیکھ کر چلایا۔ گاہک خواہ مخواہ منہ اٹھائے چلے آرہے ہیں۔

نوواردوں نے تینوں بہنوں کی طرف دیکھا۔

بناٹھی اور ان کے قریب جا کر کہنے لگی۔ ”آپ کچھ دیر کے بعد آ جائیں۔ ان کے جانے کے بعد۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ آ پیٹھی۔

”ہاں تو،“ جمیل بولا ”ان کی صفات سنو۔ یہ بنتو مر نہم ہے۔ ایسی مرہم جو ہر قسم کی جلن دو رکرتی ہے پھوڑا ہو سچنسی ہو، غم و تفکر ہو۔ عشق ہو۔ روپے پیسے کا نقصان ہو جائے۔ پر یہ شانیں ہو۔ کچھ ہو۔ اس کے پاس آ جاؤ۔ ایسا چھا بار کھے سب غم دور کیوں بنو۔“

ایلی نے بتو کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود کہ بھری بوٹل ہو۔ اس کے ہونٹ پہنچ ہوئے تھے۔ آنکھیں مناک تھیں۔

”اور یہ دیکھو گوری یہ گوری نہیں گوارا ہے تم نے بھی گورے دیکھے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ اس کمی فوج کا گوارا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھو بلی ایسی ہیں اور یہ ہر وقت مسکاتی ہے ہر وقت بارش ہو دھوپ ہو گرمی ہو سردی ہو۔ اس بوٹل سے ہمیشہ چھینٹے اڑتے ہیں۔ یہ تمہیں بہلا سکتی ہے۔ بچہ بن کر تم سے کھیلے گی۔ بننے گی۔ ہنسائے گی۔ دکھ دو رہنیں کر سکتی لیکن ہنسا سکتی ہے۔ کھلا سکتی ہے۔ ہے تو گورے کی طرح حرامی مگر ساتی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ دیر کی ساتھی۔

”اور یہ بنو۔“ اس نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا ”بس دیکھ لواسے۔ یہ تو خالص پٹاخہ ہے۔ ان چلا پٹاخہ۔ نہ کوئی اسے چلا سکتا ہے نہ کوئی اس سے کھیل سکتا ہے۔ اگر افطراب پیدا کرنا ہو۔ اگر دیوانگی حاصل کرنی ہو۔ اگر اطمینان کھونا ہو۔ اگر طوفان کے چکولے دیکھنے ہوں تو اس سے آملو۔ یہ ایک ہنگامہ ہے۔ با رو دہے منچھل پوٹاش ہے۔“

”اور ایلی یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں میں دو سال گزارے ہیں دو سال۔ اب یہ تمہارا گھر ہے سمجھے اور اگر تم نے یہاں با قاعدہ حاضری نہ دی تو مجھ سے براؤ کوئی نہ

ہوگا۔“

اگلے روز جب ایلی سکول گیا تو اس کی طرف انگلیاں انھری تھیں۔ لڑکے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان لڑکوں کو کنٹرول کریگا۔ کس طرح ان کیا منے استاد کی حیثیت سے کھڑا ہو گا۔ لیکن اس معاملے میں اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اس نے کبھی رسمی استاد کی طرح بچوں سے سلوک نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی رسمی طور پر سبق نہ پڑھایا تھا۔ اس کی باتیں سن کر لڑکے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے جیسے جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ مسکرانا شروع کرتے اور بالآخر اس کے دوست بن جائے۔ خاص طور پر وہ شیطان لڑکے جنہیں کنٹرول کرنے مشکل سمجھا جاتا تھا۔

نویں جماعت میں داخل ہو کر اس نے پہلے ہی سبق میں چکلے کے موضوع پر اظہار خیال شروع کر دیا تا کہ بچوں کے دل کی بات پھوڑانہ بنانا جائے۔

ڈیرہ میں وہ واحد شخصیت جس نے ایلی کو ممتاز کیا، غلام کی تھی۔ اس کا نام غلام علی تھا لیکن کبھی اسے غلام کہتے تھے بلکہ وہ خود اس بات پر مصروف ہوتا کہ اسے غلام کہا جائے۔ وہ کہا کرتا۔

”بھی گھروں نے مجھ پر زیادتی کی ہے کہ علی کی غلامی کا اعزاز بخش دیا۔ اس اعزاز کا میں اہل نہیں۔ اتنی عظیم شخصیت کی غلامی _____ نہ بھی میں تو اللہ کے ہر بندے کا غلام ہوں۔ آپ کا۔ انکا۔ سب کا۔“

غلام کا رنگ گورا تھا۔ جسم بھرا بھرا اور خدوخال میں جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد پر اڑتھیں ان کا رنگ شربتی تھا۔ نکھرانگھرا اور ان میں شرارت یوں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں کہ اس معزز چہرے پر ان آنکھوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں ہر وقت سوئے کی بو تلمیں کھلتی نظر آتی تھیں۔ ایک عجیب سی پھوار پڑتی اور دیکھنے والوں کو اثر سے بھگو دیتی۔

غلام کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ وہ نظر بھر کر راہ چلتی ہوئی خاتون کو دیکھے گا تو وہ محصور ہو کر اس کے پیچھے چل پڑی۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہر کر اس کے قدموں میں آگر گی۔ لیکن غلام عورت کو دیکھ کر نکاہ ہے جھکا لیتا تھا اور اتنے ماں اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ نکاہ بھر کر کسی عورت کو دیکھنے لے۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا جیسے اس نے دلی والے حاجی صاحب کی بنائی ہوئی مرہم کی دو سلائیاں آنکھوں میں لگا رکھی ہوں۔

غلام

غلام سے ایلی میں ملاقات الطاف اور اسدی وساطت سے ہوتی تھی۔

الطاف ان لوگوں میں سے تھا جو ہر امور مباردے تعلقات پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اور بلا تکلف اسے کھانے کی دعوت دینے کے مشتق۔

الطاف کی دعوت اس کے چھوٹے بھائی ارشد نے دی۔ ارشد نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ تین بھائی تھے۔ الطاف۔ اسد اور ارشد۔ اسکوں سے تحصیل کر چکا تھا اور اب لاہور کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ ارشد کی بات سن کر ایلی نے اسے ہال دیا۔ کہنے لگا۔

”بھائی۔ ہم تمہارے بڑے بھائی سے واقف نہیں۔ ان سے جا کر کہنا کہ ناواقفوں کو کھانا کھلانا اچھا نہیں ہوتا۔“

شام کو الطاف خود آگیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بولا میر انام الطاف ہے۔ میں ارشد کا بڑا بھائی ہوں۔ مجھے اب تو ہماری واقفیت ہو گئی۔ اب چلے گھر۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائیگا۔“

الطاف کی معصومیت اور سادگی سے ایلی بے حد متاثر ہوا۔

اسی روز کھانے پر جب الطاف کو معلوم ہوا کہ ایلی کو راگ سے دل چھپی ہے تو وہ

بولا چلے آپ کو اپنے کو ایک دوست سے ملاوں۔ اسے موسمیتی سے دل چھپی ہے۔“
یہ کہہ کر اس نے اپنے بھٹلے بھائی اسد کو اشارہ کیا اور وہ گوند ہے ہونے آئے کا
گولا اچھاتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ جتنا ہی الطاف سادہ طبیعت تھا اتنا ہی اسد
بھڑکیا تھا۔

وہ یوں بات کرتا چھیسے ابھی ابھی ولایت سے تخلیل علم کر کے آیا ہو۔ بہر حال
اسد کی نسبت ایلی کو اس آئے لوگوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک انگلینڈ ریٹرٹ
خوبصورت جوان جس نے ایک اچھا سوٹ ریب تن کر رکھا تھا وہ آئے کے گوئے
سے کیوں کھیل ریا تھا۔ اور یوں برس حام۔

جب وہ غلام کے گھر پہنچ تو ایک بیکنے میں روازہ گھولा۔ اور بیٹھک کی طرف
اشارة کر کے چلا گیا۔ بیٹھک میں میز پر چھٹا ایک گتا میں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کریاں
رکھی تھیں۔ ایک طرف بستر لگا ہوا تھا۔ دوسرا طرف فرش بچھا ہوا تھا اور فرش کے
ایک کونے پر جائے نماز پر غلام نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ جائے نماز کیسا تھا ہی
ایک ستار رکھی ہوئی تھی۔

وہ سب چپ چاپ بیٹھ گئے۔ الطاف نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اسے دیکھنے
لگا۔ اسد نے کونے سے ایک گٹھڑی اٹھا لی۔ اسے گھولاتو اس میں سے طبلے کی جوڑی
نکل آئی۔ پھر اس نے آئے کے گوئے کو جو وہ ساتھ لایا تھا تو اُنکر اس پر لگانا شروع
کر دیا۔ ایلی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہوں تو یہ آئے کا گولا طبلے پر لگایا جاتا ہے۔

غلام نے سلام پھیرا اور پھر کسی سے کئے بغیر سلام پھیرا اور پھر کسی سے بات کئے
 بغیر سلام علیکم کئے بغیر ستار اٹھا لی اور اسے بجانے لگا۔ اسکے ساتھ ہی مدھم لے میں
اسد نے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔

وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ستار گویا کراہ ہی تھی۔ اور طبلے کی تھاپ دل میں اترتی
جاری تھی۔ ایلی یہ بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کون ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کوئی

دس منٹ کے بعد دفتارِ دھن دھن کی آواز آئی اور سازختم ہو گیا۔ غلام مودوبانہ اٹھے بیٹھا۔

”معاف کیجئے۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو گر بولا ”میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ کو انتظار کی زحمت کرنی پڑی۔“

”لیکن آپ اپنے ستار بجا رہے تھے۔“ ایلی بولا۔

”نہیں تو۔“ غلام بولا ”میں تو نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔“

”دعا مانگ رہے تھے تو۔“ ایلی نے دو ہرایا۔

”جی۔“ غلام سے کہا۔ ”وہ ازبان سے نہیں مانگ جاسکتی۔ دل کے تاروں کی لرزشوں سے مانگی جاتی ہے۔“

”اور یہ ستار غلام کا دل ہے۔“ اسد نے نہیں کہا۔

”بس یہی ہے۔“ غلام بولا ”میری ساری کائنات یہ ستار ہے اسی سے نماز پڑھتا ہوں۔ اسی سے دعا مانگتا ہوں۔ یہی بھلکتی ہے۔ یہی نروان ہے۔“

سوڑے کی دو بوٹیں کھلیں۔ رنگ پچکاری کی پچوار پڑی۔ پنگھٹ جھول کر پاس آگیا۔

گوپیوں کی قطار میں رقص کرنے لگیں۔ دور کنہیا کی مرلی کی مدھمریں گونج رہی تھیں۔ ایک ساعت کے لئے ایلی بھونچکارہ گیا۔

ارے۔ یہ کیا چیز ہے۔ یہ نمازیں یہ دعائیں یہ لرزشیں اور یہ نگاہ۔ بس ایک ساعت میں نہ جانے کیا کر دیا۔ ایلی غلام کا غلام بن گیا۔ اس کے بعد ایلی کا دستور ہو گیا۔ سکول سے فارغ ہونے کے بعد رات کا کھانا کھا کر وہ غلام کے پاس جا بیٹھا۔ غلام جائے نماز پر ستار بجا تا۔ ایلی اپنا سر گھٹنوں میں دینے بیٹھ رہتا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے۔ بے مقصد آنسو غم کے نہیں وافر جذبات کے آنسو۔ حتیٰ کہ عشا کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ اور غلام اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا اور ایلی گھر چلا آتا۔

کرم نوازی

چند ہی دنوں میں ایلی غلام کا بے تکلف دوست بن گیا بلکہ ایلی کو غلام سے محبت ہو گئی۔ غلام کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی لیکن نہ جانے اس رنگینی کے دھارے کا رخ کدھر کو مر گیا تھا۔ اس رنگ پچکاری نے روپ بدل لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ سادگی اور عجز اور بے نیاز کی ایسی محسوس کرتا تھا جیسے غلام، وہ سکی کی ایک ایسی بوتل تھا جس میں سے شراب انڈیں رہا۔ اب زم زم بھر دیا تھا۔

ایک روز ایلی نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”غلام تم غلام کیوں ہو۔؟“

غلام نے جواب دیا۔ ”میں اونکوں کا نام بنتا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں بن سکا۔ اپنا غلام نہیں بننا چاہتا لیکن ہوں اور“

”پھر غلام کیوں کہلواتے ہو۔؟“

”اس لئے کہ میں غلام ہوں۔ اپنے مرشد کا غلام ہوں۔“

”تو کیا تمہارا کوئی مرشد بھی ہے۔؟“

”ہاں ہے۔“

”میں تو تمہیں مرشد بنانا چاہتا تھا۔ ایلی نے کہا۔

”تو بنا لو۔ چاہے کسی کو بناو۔ مجھے بناو میرے حضرت صاحب کو بناو یا کسی پتھر کو بناو یا کسی بائی کو بناو لیکن بناو ضرور۔ بے مرشد جینا تو بالکل ایسے ہی جیسے بے چوار کی باؤ۔“

”جسے چاہوں بناوں۔ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نشہ اندر سے نکلتا ہے اپنے اندر سے جتنا گڑ تمہارے اندر ہے اتنا بیٹھا ہوگا۔ ہر صورت میں ہو جائے گا۔“

”کیا تم میں گڑ ہے۔؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تھا۔“ وہ بولا بہت تھا۔ بے انداز تھا لیکن میں نے تو سارا بیہر بھوٹیوں کو کھلا دیا۔“

”ہوں۔“ ایلی ہنسا۔ ”تو تمہاری زندگی میں بیہر بھوٹیاں تھیں۔“
”تھیں۔“ وہ بولا بھائی صاحب۔ بیہر بھوٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری زندگی داستان بے حد مختصر ہے۔ عورت شراب اور راگ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ جس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لیتا تھا۔ وہ آپ ہی چلی آتی تھی۔ یوں چلی آتی تھی جیسے پینا نہم کے زیر اثر ہو۔ اور پھر اپنی عاویت تھی کہ ہر راہ گیر کرو آنکھ بھر کر دیکھتا تھا حتیٰ کہ انکا کیوں گ جاتا تھا۔ وہ بہنے لگا۔ ”میں نے تو اپنا سارا لفڑا ان بیہر بھوٹیوں کو لکھا دیا۔ اگر وہ سال پہلے مرشد مل جاتے تو آج یہ بہت بڑا ای بنا ہوتا تھا۔“

”اور اب؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اب تو کچھ ذرے رہ گئے تھے۔ سارا ہی لٹا بیٹھا تھا۔ شکر ہے اللہ کا اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو _____ نہ جانے کیا ہوتا۔“

”غلام۔“ ایلی نے پوچھا۔ تم نے مرشد کی جستجو کی تھی کیا؟“
”اوہ ہوں۔“ وہ بولا۔ مجھے تو شور بھی نہ تھا کہ مرشد کے کہتے ہیں۔ کبھی اس زاویہ زنگاہ سے دیکھا ہی نہ تھا۔ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔“

”تو پھر کیسے مل گیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”بس اللہ نے دے دیا۔ بیٹھے بٹھانے دے دیا۔ کرم نوازی کر دی۔“

”آخر کس طرح۔ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی اک راز ہے۔ وہ بولا اسے راز ہی رہنے دو۔ تم اسے سن کر کیا کرو گے۔“

”مجھلوں اللہ پر اعتماد ہی نہیں۔ ایلی نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ اس نے ایک بھر پور زنگاہ ایلی پر ڈالی۔ تمہیں اعتماد نہیں ہے، اسے تو ہے۔“ اس نے ستاراٹھا می اور بجانے لگا۔

ایلی نے کچھ کہنا چاہا تو غلام نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کر دیا۔

”باقی کرنے سے کچھ نہیں ملتا۔“ وہ بولا ”سنوسن سن کر کان بھرلو۔ پھر یہ بوند
بوند دل میں لپکے گا اور ایک روز دل کی ناوجوریت میں پھنسی ہوئی ہے ان بوندوں
کے پانی میں بہہ نکلے گی سنو۔“ اور وہ مدمحم آواز گانے لگا۔

میں چوہڑی سرکار دی ہاں میں چوہڑی

نورانی

ڈیرہ میں ایلی کی زندگی کا مرکز غلام بن گیا۔ غلام کی ستارنے نہ جانے ایلی پر
کیا جادو کر دیا۔ اس کی تاروں کی لرزشوں نے ایلی کے دل میں ایک خلاپیدا کر دیا۔
اس سے پہلے جب بھی اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا تو وہ فورا شہزاد پر مرکوز ہو
جاتا تھا اور وہ شہزاد کے تصور میں لمحو کر رہ جاتا۔ لیکن غلام کی ستارنے گویا اسے شہزاد
سے بے نیاز کر دیا۔ اب اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا لیکن وہ شہزاد پر مرکوز نہ
ہوتا۔ اس کا کوئی بھی مرکز نہ ہوتا تھا۔ ایک لامتناہی بے مرکز جذبہ جیسے دفعتا اس کے
دل کا سوتا سمندر بن گیا ہو۔ ایک بے نام غم بے کنار۔ مگر اس کے لئے یہ کیفیت
بالکل انوکھی تھی۔

پھر ایک روز نورانی آ گیا۔

ایلی وہاں ایک سالم مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے ایک باورچی
خانہ ایک غسل خانہ۔ ایک برآمدہ اور صحن تھا۔ ان کے علاوہ ایک الگ سی بیٹھک
تھی۔ ایلی کا سامان اس حد تک مختصر تھا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ساری چیزیں سمٹ کر ایک
کمرے میں ہائی تھیں اور باقی سب کمرے خالی پڑے تھے۔

ایک روز روازہ بجا اور ایک سیاہ فام فرب پر ٹسم کا آدمی اندر واصل ہوا۔

”معاف کیجئے گا۔ وہ بولا۔ میرا نام نورانی ہے اور میں محکمہ تعلیم میں استٹنٹ
انسپکٹر ہوں۔ میرا تباولہ یہاں ہو گیا لیکن ابھی مکان کا بندوبست نہیں ہوا۔ اگر آپ

اجازت دیں تو میں چند روز کے لئے آپ کی بیٹھک میں ٹھہر جاؤں۔ میں آپ کو کرایہ ادا کروں گا۔ اور جب بھی چاہیں گے بیٹھک خالی کر دوں گا۔“

ایلی نے غور سے اس لمبے ترے نے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔

چہرے پر عجیب سی کرختگی تھی۔ مانتھے پر تیوری چدھی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی خوف ناک کشش تھی اور نام نورانی۔ سچان اللہ کیا نورانیت ہے۔ ایلی نے سوچا۔

”بہت اچھا۔ ایلی نے کہا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فی الحال۔“

شکریہ۔ نورانی نے کہا وہ بے تکلفی سے اپنا سوت کیس اور بستر اٹھا کر بیٹھک میں گھس گیا۔

نورانی خاموش طبع آدمی تھا۔ سارا دن وہ چپ چاپ بیٹھا کام میں مصروف رہتا اور یا باہر دوڑے پر چلا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کے لئے اس کی موجودگی نہ ہونے کے بر امیر رہی۔ وہ آپس میں کبھی کھاربات کرتے تھے۔

”کہیے نورانی صاحب۔ ایلی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

”بس دیکھ لیجئے۔ وہ جواب دیتا اور بدستور کام میں مصروف رہتا۔

”آپ تو ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔“

” المصروف رہنا اچھا ہوتا ہے۔ وہ جواب دیتا۔

نورانی کے منہ پر کبھی تبسم نہ آیا تھا۔ قہقہہ مار کر ہنسنا تو گویا اس کی سر شست کے منافی تھا۔ ایک اور تعجب خیز بات تھی کہ نورانی دو دھن بہت پیتا تھا۔ ہر وقت اس کی میز پر دو دھن سے بھرا ہوا گلاس پڑا رہتا کام کرتے کرتے وہ گلاس اٹھاتا۔ دو چار گھونٹ پی کر پھر کھادیتا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنا دو دھن پینے کے باوجود نورانی کے چہرے پر دو دھن کا نام نشان تک نہ تھا۔ چہرے کی کرختگی اور تناؤ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور مانتھے کی تیوری یوں دکھائی دیتی تھی۔ جیسے لوہے میں میخ کی مدد سے لکیری کھود دی گئی ہو۔

ایک روز غلام آگیا۔ اس وقت ایلی نورانی کے پاس کھڑا تھا۔ ایلی نے غلام کا

نورانی سے تعارف کرادیا۔

پیشاپ کاملکہ

اسی شام جب غلام علی اور ایلی اکٹھے بیٹھے تھے تو نورانی کی بات چل پڑی۔

”عجیب بات ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ شخص اتنا وودھ پیتا ہے لیکن اسکے چہرے پر اتنی کرختگی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔“

”اوہ ہوں۔“ غلام نے جواب دیا۔ بھی وہ تو لوہے کا آدمی ہے۔“

”لوہے کا آدمی۔“ ایلی نے ویرایا۔

”ہاں ہاں۔“ غلام بولا۔ ضرور وہ کوئی چیز استعمال کرتا ہے۔ سکھیا کچلا۔ اس لئے اس کا جسم لوہے کی خصوصیات کا حامل ہے۔“

”سکھیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“

”وہ تو زہر ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہے۔“

”تو پھر۔“

”پھر کیا۔“ غلام بولا۔ ”تمہارے چہرے پر بھی تو کرختگی ہے۔“

”میں تو سکھیا نہیں کھاتا۔“

”یہ تمہارے خیالات کی وجہ سے ہے۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری شخصیت میں مطہاس نہیں تلخی ہے۔ جذبات میں رنگ نہیں شدت ہے۔ تمہارا صفر اسودا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔“

”اے۔“ ایلی چلایا۔ تم طب جانتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”واقعی۔“

”ہاں۔ طب ہمارے خاندان میں صدیوں سے چلا آتا ہے۔ میں بھی سنھیا استعمال کیا کرتا تھا۔“

”کیوں۔“

”تمام تماش بینی کرتے ہیں؟“

”لیکن تمہارے پھرے پر تو دودھ اسی دودھ ہے۔“

”یہ میرے سر کا قابلہ کی کرم نوازی ہے۔ ان کی دین ہے۔“

ایلی کے لئے سر کا قابلہ اور کرم نوازی ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا۔ لیکن سر کا قابلہ اور کرم نوازی پر پہنچ کر گویا اس کے پر جل جاتے اور پھر وہ ایک بے نسب کیلئے کی طرح رینگتا۔ ان پر احساس مکتری کا منوں بوجھ پڑ جاتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اس مشکل سے مخلصی حاصل کرے۔ اس کا ذہن سر کا قابلہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اسے رو نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب آ کھڑے ہوتے۔ ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ہلتا۔ ان کی روشن آنکھیں چمکتیں۔

”وقت آئے گا۔ وہ مسکرا کر کہتے۔“

پھر عربی مولوی کی کرخت آواز گوئی۔

”اس شعبدہ بازقا در مطلق کے تماشوں کی حد ہے کوئی۔ دم مارنے کی گنجائش بھی ہو۔“ وہ قہقہہ مار کر نہیں۔

ایک روز بیٹھے بیٹھائے ایلی نے غلام سے حاجی صاحب کا مذکورہ چھیڑ دیا اور شہزادہ کی بات چھوڑ کر باقی سب کہانی سنادی۔

غلام مسکرا تارہا۔

جب ایلی بات ختم کر چکا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ہاں وقت آئے گا۔ تمہارے مانچے لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہیں سر کا قابلہ ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ میں نے پہلے ہی

دن دیکھ لیا تھا۔ آتا ب ان آنے والے حضور کا ذکر کریں۔“

اس نے ستاراٹھالی اور مدھم آواز میں گانے لگا۔

”اب ہونا یئے کن دھوئین بھرمائے۔ اب ہونا آئے۔“

اس روز پہلی مرتبہ ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی سر کار قبلہ اسکی زندگی کو بھی منور کر دیتا۔

چونکہ ایلی کو ان حمریوں اور خیالوں کے بولوں سے بے حد دچپتی تھی جو غلام گایا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے غلام سے کہا کہ یہ گیتوں والی کاپی مجھے دے دو میں نقل کر کے لوٹا دوں گا۔

”کاپی۔“ غلام بولا۔ لیکن یہ تو میرے سر کار قبلہ کی کاپی ہے۔“

”اس میں تو گیت لکھے ہوئے ہیں۔“

”اس میں گیت ہیں۔ منا جاتیں ہیں۔ قولیاں ہیں یہ سب قولیاں گیت اور راگ سر کار قبلہ کے ہیں۔ میں چاہیل کچھ بھی گاؤں رونے سخن ان کی طرف رہتا ہے۔ اس برات کے دواہا وہی ہیں۔ صرف وہ اور نہیں باقی سب ہوں۔“ غلام نے ایک دل دوڑنگرہ لگایا۔

بہر حال ایلی نے وہ کاپی غلام سے لے لی اور گھر چلا آیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔

سر دیوں کے دن تھے۔ اس نے اس وقت گیت نقل کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا چلو کل نقل کرلوں گا اور شام کو کاپی لوٹا دوں گا۔ کیونکہ غلام نے تاکید کی تھی کہ گیت نقل کر کے جلد کاپی لوٹا دے۔

رات کے دو بجے کے قریب دروازہ بجا۔ ایلی جاگ پڑا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے کون ہے۔ شاید پڑوس کے دروازے پر ہو۔

دروازہ پھر بجا۔ شاید نورانی کا دوست ہو گئی۔ یہ سوچ کروہ خاموش پڑا رہا۔

پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی کوئی با تین کر رہا تھا۔ پھر پاؤں کی چاپ سنائی دی اور نورانی اور غلام اس کے سر ہانے آکھڑے ہوئے۔

”اے تم ہو،“ ایل چالا یا۔

”ہاں۔“ غلام مسکنے لیا۔

”حیرت ہے۔“

”مجھے وہ کاپی دے دوئے۔“

”کاپی۔ کیا کاپی لینے کے لئے آئے ہو۔“

”ہاں۔“

”اس وقت۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”بھی۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری کاپی اس پیشਾپ کے ملکے میں کیوں پھینک آئے ہو۔“

”اے۔“ ایل کا دل ڈوب گیا تو کیا میں پیشਾپ کا مٹکا ہوں۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ غلام نے کہا۔ وہ بہتر جانتے ہیں۔“

غلام نے کاپی لے کر چلا گیا لیکن ایل کورات بھرنیدنہ آئی۔ جب بھی وہ آنکھ بند کرتا تو اس کے روپ و ایک بڑا سامنکا آ جاتا اور اس میں سے بدبو آتی۔ اور اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ وہ دل ہی میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور طنز احاجی صاحب سے کہہ رہا تھا۔ آپ تو کہتے تھے وقت آئے گا لیکن اب پیشਾپ کا مٹکا۔“

ایل کو عرصہ دراز سے مسلسل بول کی شکایت تھی۔ اس رات شرمندگی کی وجہ سے ساری رات وہ پیشਾپ کرتا رہا۔

سلسل البوال۔

ایلی کی یہ سلسل البوال کی شکایت بھی ایک عجیب واقعہ تھا۔

جس زمانے میں وہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو اس کی نوراحمد سے بڑی دوستی تھی۔

نوراحمدان کا دور کارشنہ دار تھا اور وہ لا ہورا پولیس میں نظر تھا۔ جب کبھی میس کی عدم ادا یگنی کی وجہ سے ایلی کی حاضری بند ہو جاتی اور اسے بورڈنگ میں کھانے سے جواب مل جاتا تو نوراحمد سے اپنے ساتھ یجا تا۔ اور اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر اسے لکھاتا۔ نوراحمد کی شادی ہوئی لیکن اس کی بیوی مرچکی تھی اور وہ عرصہ سے اکیلا رہ رہا تھا۔
نوراحمد کی ایلی سے برا اور اس کی محبت تھی اور ایلی کو نوراحمد سے بڑی عقیدت تھی کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نوراحمد سیکھتا تھا اور اسے لا ہور کا بے پناہ تجربہ تھا۔

ایک مرتبہ نوراحمد کو نہ جانے کیا تکلیف ہو گئی اور ہو چھٹی لے کر علی پور آگیا۔ اس زمانے میں ایلی کو گرمی کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ اور وہ علی پور ہی میں تھا۔ نوراحمد آتے ہی ایلی سے ملا۔ کہنے لگا۔

”بھائی ذرا بآہر چلنا ہے۔“

”لیکن کہاں۔ ایلی نے پوچھا۔

”ذرا بآہر جانا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

طبعی طور پر نوراحمد کھل کر بات کرنے کا عادی تھا۔ وہ ہر بات کو راز رکھتا اور صرف اسی بات کا اظہار کرتا جسے وہ ضروری سمجھتا۔

شہر سے باہر جا کر وہ پرانے مقبرے میں گھوتتے رہے اور نوراحمد ان مقبروں کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے چونا اکھڑتا رہا۔

”یہ کس لیے ہے۔ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی ہے۔ نوراحمد نے جواب دیا۔

”لیکن کس لئے اکٹھا کر رہے ہو۔“

”کام آئے گا۔“

”کس کام۔“

”دوائی کے طور پر۔“

”یہ دوائی بنانی ہے کیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“

”کس کے لئے۔“

”اپنے لئے۔“

”بیمار ہو۔“

”ہاں۔“

”کیا بیماری ہے۔“

”سو扎ک ہو گیا ہے۔“

”ارے۔ ایلی اچھلا۔

نوراحمد نے یوں سرسری بات کی تھی جیسے کوئی بات نہ ہو جیسے سوزاک نہ ہوا سر درد ہو گئی۔ یہ نوراحمد کی عادت تھی۔

گھر پہنچ کر نوراحمد نے ایک کورا گھڑا لیا۔ وہ پرانا چونا دھوکر اس میں ڈال دیا اور پھر اسے پانی سے بھر دیا۔ اگر میوں کے دن تھے۔ وہ دونوں سارا دن اکٹھے بیٹھے گپیں ہائکتے رہے اور نوراحمد ہر دس منٹ کے بعد ایک گلاس میٹکے میں سے بھرتا اور غٹ غٹ پی جاتا۔ ایلی نے پیاس محسوس کی۔ نوراحمد بولا۔

”یہی پانی پیو۔“ تمہارے لئے بھی بہت فائدہ مند ہو گا۔ جگر کی گرمی اٹھائے

گا۔“

اس کے بعد ہر دس منٹ بعد دو دونوں اکٹھے پیش اپ کرتے اور پھر ایک ایک گلاں پانی پی کر پھر سے بیٹھ جاتے۔ دس پندرہ دن کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ اسے سلسلہ بول کی شکایت ہو گئی ہے لیکن اس نے اسے چند داں اہمیت نہ دی۔ دو ایک سال گزر گئے۔

اس کے بعد ایلی نے محسوس کیا اسے سلسلہ بول کی بیماری ہو چکی ہے۔

فرضی کتاب

ان دونوں اس کا خالہ زاد بھائی جو میری یکل کانج میں تعلیم پانے کے بعد جس کے ساتھ اٹپچڈ باتھنے تھا۔ والائیت میں ایم ڈی کی ڈاکٹری حاصل کرنے چلا گیا۔ واپس وطن لوٹا اس کے ساتھ لاس کی آرٹش بیوی بھی تھیں۔ ایلی نے ڈاکٹر کو خط لکھا جس میں اس نے اپنی تکلیف کے متعلق فلم مندی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے اسے لا ہور بلا لیا۔

جب ایلی لا ہور پہنچا تو ڈاکٹر نے اسے کہا:

”ویکھو بھائی جو علاج کرنا ہے تو آٹھ روز میرے پاس رہو۔ یہاں تمہیں صرف ایک تکلیف ہو گی۔ ہم لوگ رات کا کھانا پونے آٹھ بجے کھاتے ہیں اور پھر آٹھ بجے لیٹ کر سو جاتے ہیں یہ بندش تم پر بھی رہے گی۔“

ڈاکٹر نے رات کے آٹھ بجے ایلی کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جس کے ساتھ اٹپچڈ باتھنے تھا۔

”لیکن میں پیش اپ کہاں کروں۔ ایلی نے پوچھا۔

”تمہارے کمرے میں دو کھڑکیاں ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ باہر با غصہ ہے۔ جب چاہو باہر نکل کر پیش اپ کرو۔ لیکن۔ ڈاکٹر رک گیا۔ ”ذرا احتیاط سے باہر با غصہ میں جانا۔“

”کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”رات کو کتا کھلا ہوتا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

ایمی روز ڈاکٹر سے کہتا کہ وہ اس کا معاون کریں لیکن ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی بھانے نہال دیتے۔ آٹھویں روز ایمی کے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا سامان باندھا اور علی پور جانے کی تیاری گرفتی۔ جب ڈاکٹر نے خنا کروہ خفا ہو کر جا رہا ہے تو اس نے جلدی سے کاپی اٹھائی اور میز لگا کر بیٹھ گیا۔

”ہاں بھی ایمی۔“ وہ بولا جانے سے پہلے، ہستری تو بتا جاؤ۔“
ایمی کا غصہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر آصفی بے علاج کرنے پر رضا مند ہی نہ تھا لیکن اس کی آڑش بیوی نے آگرائی ایمی با تین کیس کوہ کیس ہستری دینے پر مجبور ہو گیا۔“
”ہاں بھی ایمی۔ ڈاکٹر نے کہا۔“ میں دون میں کتنی بار پیشاپ آتا ہے۔“
”میں نے کبھی گناہ نہیں۔“

”پھر بھی اندازہ۔“

”یہی آٹھویں بار۔“

”اور پیاس کی کیا حالت ہے۔“

”بار بار پانی پیتا ہوں۔“

”کے بار۔“

”بس ایک چکر ہے۔ ادھر گلاس پانی کا پیا ادھر پیشاپ کیا۔ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔“

”سر دیوں میں زیادہ آتا ہے یا گرمیوں میں۔“

”دونوں موسموں میں ایک سا۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ دون میں کون سے وقت زیادہ پیشاپ کرتے ہو۔“

”کیا مطلب۔“

”صحیح کے وقت زیادہ یا شام کے وقت۔“

”سونے سے پہلے۔“

”شام کو یارات کو۔“

”لیٹ جانے کے بعد چاہیے جس وقت لیٹ جاؤں۔ جب تک نیند نہیں آتی تپ تک۔“

”اچھا تو اب ان گز شستہ آٹھ دنوں کے کوائف لکھواور مجھے۔“

”جی۔“

”کل رات لیٹنے کے بعد سونے تک کسے مرتبہ پیش اپ کیا۔“

ایمی سوچ میں پڑ گیا۔

”انداز۔“

”کل تو نہیں کیا۔“

”ہوں۔ اچھا پرسوں۔“

پرسوں بھی نہیں۔“

”ایک بار بھی نہیں۔“

سارا دن تو کرتا رہا تھا۔

”دن کی بات چھوڑو۔ بستر پر لیٹنے اور سونے کے درمیان کے وقٹے کی بات کرو۔ اچھا اتر سوں۔“

”نہیں۔“

ڈاکٹر آصفی نے قہقهہ لگایا۔ بولا۔ ”دیکھوایں میں نے تمہیں آٹھ دن اندر آبز رویشن رکھا ہے اور گز شستہ آٹھ روز تم نے سوتے وقت پیش اپ نہیں کیا حالانکہ یہ وہ وقت ہے جب کہ تمہارے بیان کے مطابق بہت زیادہ پیش اپ آتا ہے۔ اگر تمہاری اس بیماری کو ایک خیالی کتے کا ڈرروک سکتا ہے تو بتاؤ یہ بیماری جسمانی ہوئی ہوئی۔

وہی۔ میری جان! تمہیں کوئی بیماری نہیں۔“

ڈاکٹر آصفی کا تھقہہ دیر تک گونجتا رہا حتیٰ کہ علی پور جاتے ہوئے گاڑی کو چھکا چکھے میں بھی وہ ڈاکٹر کے تھقہہ کو آواز سنتا رہا۔ آج پھر وہ ڈاکٹر کی آواز سن رہا تھا۔ ہی ہی ہی۔ ایلی بھی تمہارا علاج تو سہل ہے۔

خسل خانے میں ایک کتاباندھ لوہی ہی ہی ہی۔“

پیشاپ کامٹا پیشاپ کامٹا!

”بیو۔ بیو۔“ تو راحمہ پونے کے گھرے سے پانی نکال کر اسے دے رہا تھا۔ یہ تمہارے جگر کی گرمی اٹھائے گا۔ اگلے روز صبح صوریے ایلی کے سر پر ایک دھن سوارتھی۔ صرف ایک دھن۔ پس پاٹ چور۔

اس روز وہ سکول بھی نہ گیا بلکہ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ انچارج ڈاکٹر محمد علی اس کا اچھی طرح سے واقف تھا۔ وہاں اس نے ایلی کی تمام کیس ہشتری بڑے غور سے سنی۔ پیشاپ لٹٹ کیا اور پھر بولا۔

”ایساں صاحب، ہمارے کمیکل امتحان کا سامان تو ہے لیکن ماں سیکر و سکوپک لٹٹ کا انتظام نہیں لہذا آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو لاہور چلے جائیں۔ وہاں کے سول سرجن میرے دوست ہیں۔ ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ ان سے جا ملیں وہاں ماں سیکر و سکوپک لٹٹ کا انتظام ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر محمد علی کا خط دیکھ کر سول سرجن اسے بڑی گرم جوشی سے ملا۔

”کیا آپ پیشاپ ساتھ لائے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں تو ڈیرہ سے آیا ہوں۔“

”اوہ ٹھیک ہے۔ وہ بولا۔ یہ تو کیس ہی مختلف ہے۔ فریکوننسی آف یوران کی

شکایت ہے نا۔” انہوں نے ایک اسٹنٹ کو بلایا۔ بھی انہیں پس پاٹ دے وو اور غسل خانہ دکھا دو۔ مجھے صاحب آپ پیشاپ لے آئیے۔ انہوں نے گھری دیکھی۔ گیارہ بجے ہیں ابھی بہت وقت ہے۔ آپ شام تک ڈیرہ واپس پہنچ سکیں گے۔“

سول مرجن کے اسٹنٹ نے اسے پس پاٹ پکڑا دیا۔ وہ غسل خانے میں جا بیٹھا۔ بارہ نج گئے لیکن اسے پیشاپ نہ آیا۔ جیسے پیشاپ کا حاملہ ہی متوقف ہو چکا ہوا۔ ایک بجے اس کی پریشانی ہونے لگی۔ وہ نج گئے چار نج گئے۔ باہر ڈاکٹر چلا رہا تھا۔ ازصے بھی وہ فریکیونٹی آف یورن کا مریض کیا ہوا۔“

”کچھ پتہ نہیں صاحب۔“

”کیا اسے ابھی تک پیشاپ نہیں آیا۔ مسخرہ نہیں کوئی۔“

”کہیں پس پاٹ چڑا کر نہ لے گیا ہو۔ کمپاؤنڈ نے کہا۔

”ارے بھی دیکھنا۔ ڈاکٹر قہقہہ مار بولا۔

ایلی نے چپ چاپ پس پاٹ زمین پر رکھا اور غسل خانے کے پچھے دروازے سے باہر نکل کر بھاگا گاڑی ڈیرہ کو جا رہی تھی۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ پیشاپ کا مٹکا! ڈاکٹر آصفی قہقہہ مار رہا تھا۔ کتابیں کتا۔“

”میری کاپی دے دو کاپی۔۔۔ غلام چلا رہا تھا۔

”مسخر۔۔۔ مسخر۔۔۔ سول مرجن نہیں رہا تھا۔

ایلی کی اس ڈنی پریشانی کا کوئی علاج نہ تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کی پریشا نیوں اور خستنوں کو جذب کر سکتی تھی۔ جذب کر لیتی تھی۔ اور وہ غلام کی ستار تھی۔

وہی غلام جس کے آقا ایلی کو پیشاپ کا مٹکا سمجھتے تھے لیکن ایلی کے لئے غلام اور اس کے آقا سے دور رہنا ممکن نہ تھا اس لئے اسٹنٹ سے وہ سیدھا غلام کے گھر پہنچا۔ دروازہ ٹکٹکھا یا۔

”کون ہے۔“ غلام کی آواز آئی۔

”پیشاپ کا مٹکا۔ ایلی نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا۔

”آیا بھی آیا۔ بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ اتنے دن کہاں
رہے۔“

”میاں تمہارا ہمارا ساتھ۔ تم پورے ہم پلید تمنگ پچکاری۔ ہم پیشاپ کے ملکے۔“

غلام نے قہقہہ لگایا۔ تم تو بڑے خوش قسمت ہو بھائی جو صرف پیشاپ کے ملکے
ہو۔ پتھر ہے مجھے کیا خطاب ملا ہے۔“

”کیا؟“

غلام مسکرا یا۔ ”فرمایا۔ تم تو زبانی نفس ہو۔“

”کیا واقعی۔“

”تمہاری قسم۔“

اس ایک جملے نے ایلی کو اس قدر تسلیں دی۔ اس قدر تسلیں دی جو دنیا بھر کے
ڈاکٹرنوں سکتے تھے اور اسکی زندگی میں جو یہ نئی تلخی پیدا ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ اس کے
بعد کے اثرات ستار کی تاروں کی لرزشوں نے صابون کے بلبلوں کی طرح اڑا دیئے
اور وہ اس کراہتی ہوئی ستار کے پہلو میں بیٹھ گیا جیسے تار کو کھینچنے والی کیل ہو جو ستار
کے بازو پر گلی ہوئی تھیں۔

انوکھا زعم

ایک روز شام کیوقت ایلی بیٹھ کے باہر سڑک کے کنارے چلا گیا۔ اس نے
دیکھا نورانی وہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ بیٹھ کے باہر سڑک کے کنارے چبوڑہ تھا
جس پر بعد وہ پر آ جاتی تھی۔ نورانی اس چبوڑے پر بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔
لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز نرالا تھا۔ وہ سڑک کی طرف پیٹھ کر لیتا میز دیوار کیسا تھا لگا
لیتا۔

ڈیرہ میں وہ سڑک خاص طور پر مشہور تھی۔ چونکہ شام کے وقت ہندو خواتین پنڈت نیاں سیٹھانیاں اور لاالانیاں اس سڑک پر سیر کرتی تھیں۔ شو قین مزاج لوگوں نے اس سڑک کو پنگھٹ کا نام دے رکھا تھا۔

ایلی خود کئی بار شام کے وقت بیٹھ کے باہر چبوترے پر کھڑا جایا کرتا تھا۔ ہندو خواتین جو ادھر سے گزرتی تھیں عام طور پر خوب صورت ہوتی تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے چہروں پر شرم و حیا کی سرفی جھلکتی تھی۔ آنکھیں ہمیشہ جھکی رہتیں اور چینے کے نئے کونے تلاش کرتیں اور جسم پر اپنا اعلان کرنے کی وجہ سے سمنا سمثار ہتا۔ ایلی کو انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عصمت و عفت اور شرم و حیا کی پہاڑیوں پر نخے نخے پتھے اپنے ہوں۔

لیکن نورانی کا رو یہ عجب تھا۔ وہ سڑک سے منہ موڑ کر کیوں بیٹھا رہتا تھا۔ اسے اپنی بد صورتی کا احساس تھا۔ کیا واقعی؟

ایک روز ایلی نے طنز انورانی سے کہا۔ نورانی صاحب آپ سڑک کی طرف منہ کر کے کیوں نہیں بیٹھے۔ کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ کوئی راہ چلتی آپ کو دیکھ کر آپ کی محبت میں اسیر نہ ہو جائے۔“

نورانی نے کام سے سراٹھا نے بغیر جواب دیا۔ کیا فائدہ۔“
کیا مطلب۔“

”یہاں سے بچیاں گزرتی ہیں۔ خواہ مخواہ کسی کو الجھن میں ڈال دوں تو۔“
ایلی کامنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کیا واقعی اس خیال سے آپ سڑک کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتے ہیں۔“

”ہاں یہ ڈر ہے۔“ وہ بولا۔

”اے۔“ ایلی چلا اٹھا۔ کیا آپ خود کو حسین سمجھتے ہیں۔“
”نہیں ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر۔“

”الیاس صاحب کشش اور چیز ہے حسن اور۔“

”تو کیا آپ میں کشش ہے۔“

”باقی ہے۔“

”ہمیں تو نہیں محسوس ہوتی۔“

”آپ عورت نہیں ہیں اس لئے۔“

”ارے۔“

نورانی اٹھ بیجا۔ ایلی کے قریب آگئیں گا۔ الیاس صاحب اگر میں کسی عورت کی طرف آنکھا اٹھا کر وہ سچوں نہ کاہیں چاہ رہا ہو جائیں تو وہ میری تلاش میں آپ کا دروازہ کھلکھلاتے تو میرا ذمہ۔

”تو شرط رہی۔“ ایلی چلایا۔

”نہ بھی۔ شرط نہ لگاؤ۔ نورانی پھر سے کسی پر بیٹھ کر بولا۔

”ڈرتے ہیں آپ۔“

”ہاں وہ بولا۔“ خواہ مخواہ آپ ہار جائیں گے۔“

”ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”اس قدر زعم ہے۔“

”اس سے بھی زیادہ۔ نورانی نے کہا۔

”تو شرط رہی۔“

”اچھا۔“ وہ بولا۔ اگر آپ مصر ہیں تو۔“

”منظور ہے۔“ ایلی بولا۔

”لیکن اس میں دو چار شرائط ہو گی۔ عورت میں خود منتخب کروں گا۔ ایلی نے کہا۔

”منظور۔“ وہ بولا۔

”اگر آپ کوئی شرط عائد کرنا چاہیں تو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ نورانی نے کہا۔ ”پہلی شرط ہے ہے میرا نام اور پتہ نہ بتانا اور نہ بد نامی ہوگی۔

”ٹھیک ہے۔“

دوسرا بات یہ کہ مجھے مناسبت موقع دیا جائے کہ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ لول۔“

”ٹھیک“

”تیری بات یہ ہے شرط نہیں منت ہے۔“
”کیا؟“

”کسی معصوم بھی کو منتخب کرنا اس کی زندگی بتاہ ہو جائیگی۔
ایلی نورانی کے یقین کامل پر چیران۔“

دو دن ایلی سوچتا رہا۔ اس مسئلے پر نہ وہ غلام سے بات کر سکتا تھا نہ اسد سے اور نہ کسی اور سے۔ چونکہ اس نے نورانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس شرط کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کرے گا۔ ان کے مکان کے گرد لڑکیاں تو بہت رہتی تھیں اور وہ چلا چلا کر اپنی موجودگی کا پیغام ان تک پہنچاتی رہتی تھیں۔ سڑک پر آنے جانے والی ہندو خواتین بھی تھیں لیکن ایلی نے سوچا ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو اس قدر جہاں دیدہ ہو کر اسے فریغہ کرنا آسان کام نہ ہو۔

”... بنوا“ دفعتاً اسے خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ طائفہ بھلا کب کسی کی بنتی ہے۔ اسے کسی کا ہو جانے کا چاہ بھی نہیں ہوتا اور پھر بنو تو واقعی پٹا نہ ہے۔

بہروپیے

اگلے روزرات کے نوبجے کے قریب نورانی اور ایلی گھر سے نکلے۔ دونوں نے کالے کمبل اوڑھر کئے تھے تاکہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ سرپر گلڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایلی نے آگے آگے جا رہا تھا نورانی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جب وہ چکلے میں پہنچ تو نورانی رک گیا۔

”اچھا تو طوائف کا انتخاب کیا ہے آپ نے۔“

”یہ شرطونہ تھی کہ یہاں کی نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”مشکل کام دیا ہے آپ نے نورانی بولا۔ لیکن پچھے پروانہیں چلئے۔“

بنو کے گھر جا کر ایلی نے کمبل اور گپڑی اتاری اور بے تکلفی سے ان سے باقیں کرنے لگا۔

”آئیے۔ وہ بولا۔ آپ کو اپنے ایک ووست سے ملاوں۔ یہ آج ہی دلی سے آئے ہیں صرف ایک روز کے لئے ٹھیریں گے یہاں ڈیرے میں۔“

”آپ کی تعریف۔“ بتو بولی۔

ایلی نے جھٹ جواب دیا۔ عظمت خال۔

”بڑا اٹھا شدھدار نامہ۔ گورا ہنسی۔“

”خود بھی تو ٹھاٹھدار ہے۔ ایلی نے کہا۔“

”دنی الحال تو گپڑی اور کمبل ہی وکھائی دیتے ہیں۔ گورا ہنسی۔“

”اور یہ پتھریں چلتا کہ کمبل کھاں ختم ہوا اور عظمت خال کھاں شروع ہوئے۔ بنو نے کہا۔

”یہی تو کمال ہے۔ ایلی بولا۔“

”خود گونگے ہیں شاید۔ گورا بولی۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ بولنا نہیں جانتے۔ دیکھنا جانتے ہیں۔ تاجر ہیں نہ اس لئے۔“

”تاجر ہیں۔“ بنو نے کہا۔

”ہاں۔“ موڑوں کا کاروبار ہے۔“

وہ سب دیری تک گپیں ہائکتے رہے۔ لیکن نورانی اسی طرح گھٹا گھٹا گم صم بیٹھا رہا۔

پھر اس نے ایلی کو کہنی ماری۔

”کونسی ہے؟“

”یہ ہے۔“ ایلی نے اعلانیہ بنو کا ہاتھ پکڑ کر نورانی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

بنو نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نورانی نے بلا تکلف بنو کا بازو سمجھ کر اسے اٹھالیا اور گھسیتا ہوا ماحقة کمرے میں لے گیا۔ بنو اور گورا حیرانی سے انکی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”گھبراو نہیں۔“ ایلی بولا۔ ابھی آ جائیں گے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔“

”ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا ہوا۔ بنو بولی۔“

”ہمیں بھی لے چل کوئی گورا نہیں۔“

”تمہیں نہیں البتہ۔“ ایلی نے بنو کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے کی طرف چل

پڑا۔

بنو چیخ رہی تھی۔ یہ کیا مذاق ہے۔“

کمرے میں پہنچ کر ایلی نے کہا۔ مذاق نہیں۔ جمیل نے کہا تھا کہ تم دکھ جذب کر لیتی ہو۔

کہا تھا نا۔ میں دکھی ہوں۔ بنو! میرا کچھ کرو۔“

وہ ہنسنے لگی۔

”گورانہ بنو۔“ وہ بولا پہنچی سے دکھ دو نہیں ہوتا۔“

”تو پھر۔“ وہ بولی۔

”مجھے بھی تو پتہ نہیں۔“ وہ بولی۔

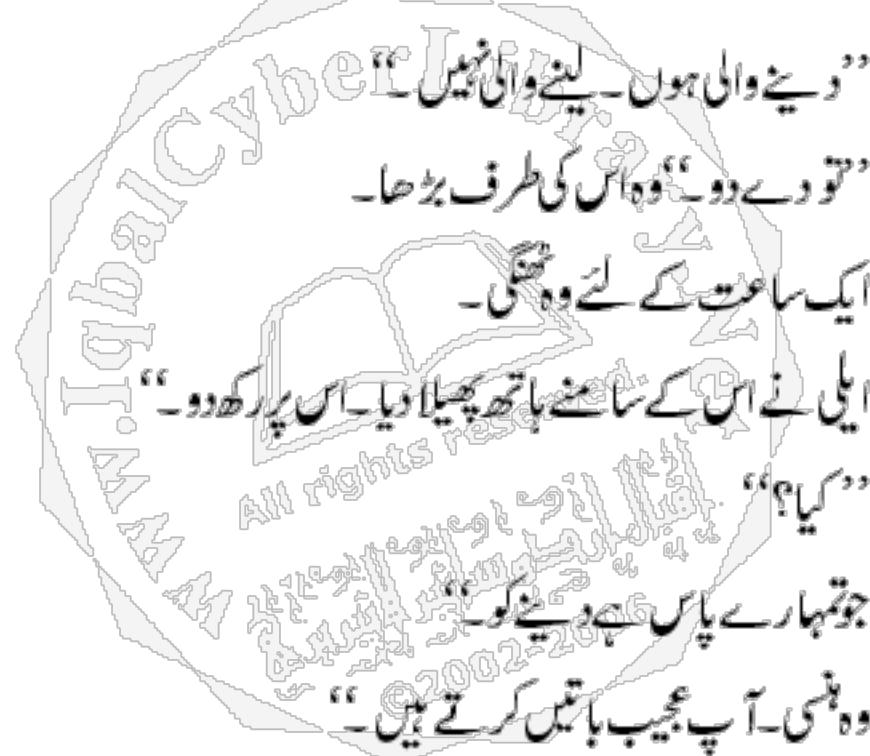
”اچھا تمہاری مرضی۔“ وہ بولا اور اس نے بنو کے ہاتھ میں میں روپے تھما دیئے۔

”یہ کیسے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”مردیوں کے دن ہیں۔ ریوٹریاں اور موگنگ چلی کھالیں۔“

”فضول۔“ وہ غصے میں چلائی۔

”شانت شانت۔ ایلی نے کہا۔ تم تو نروان دینے والی ہو۔ بخ پا کیوں ہوتی ہو۔“



”ان باقوں میں نہ پھنس جانا۔ اوپنے بول اندر سے ڈھول والا معاملہ ہے۔“

”آؤنا بھائی اب۔ نورانی نے اسے آواز دی۔

”کیوں۔ ہو گئے فارغ۔“

”لاحوال ولاقوة،“ وہ غصے میں پھنکا را۔

”اوہ میرا مطلب تھا۔ ایلی نے مغدرت کی۔

”بس گھورتے ہی رہے۔“ بنو چلائی۔

ایلی نے غور سے بنو کی طرف دیکھا۔ اس پر نورانی کی نگاہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ مر رلیا میدان۔۔۔ اس نے سوچا۔

اگلے روز نورانی دورے پر چلا گیا۔ اور دو ہی دن میں ایل بالکل بھول گیا کہ اس نے شرط بدھی تھی۔ اور بنو کو تختہ مشق بنایا تھا۔ وہ پھر سے غلام کی ستارے کے پاس جا بیٹھا اور بے بے دنی اور کیدارے میں کھو گیا۔

پیاں پڑوں گی پلنگھانہ چڑھوں گی پیاں پڑوں گی۔

چند روز بعد ایک روز جب ایمی نویں جماعت کو تاریخ جغرافیہ پڑھا رہا تھا تو
چپر اسی آیا۔

”جی لالہ جی بلا تے ہیں۔ وہ بولا۔

”لالہ جی۔ ایمی نے لاپرواہی سے دہرا یا۔

لالہ جی اسکے ہنیدہ ماسٹر تھے۔ وہ عمر میں پچپن کے قریب تھے اور طبیعت کے لحاظ سے ستر سال کے ہوں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ پیش نہیں پانے والے ہیں لہذا انہوں نے پہلے ہی پیش کی مشق شروع کر دی تھی۔ سارا دن باہر دھونپ میں یا اندر کمرے میں بیٹھ رہتے۔ وہ سبھی انتہاد سے بگڑتے نہ کسی کو منہ لگاتے۔ البتہ جب بھی بن آتی لوگوں کی مدد کرتے تھے۔

ایمی ففتر میں داخل ہوا تو بنو کو لالہ جی کے روپ و کرسی پر بیٹھے دیکھ کر گھبرا گیا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا۔

”جی لالہ جی۔“ وہ بولا۔

”یہ آپ کے مہمان ہیں۔ لالہ جی نے بنو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر بنو سے کہنے لگا۔

”آپ ذرا فتر سے باہر باغیچے میں چلنے یا بھی آتے ہیں۔“
بنو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لالہ جی نے نگاہیں جھکائیں اور بولے۔ الیاس صاحب، مجھے آپ سے یہ موقع نہ تھی دیکھنے والی عورت کا سکول میں آتا۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ نے بلانا ہی تھا تو گھر بایا ہوتا۔“

”لالہ جی،“ ایمی نے جواب دیا۔ اگر میں بلا تا تو گھر ہی بلا تا۔ اس کا یہاں سکول میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں نے اسے بلا یا ہے نہ میں اسے جانتا

ہوں۔“

لالہ جی نے آنکھ اٹھا کر غور سے ایلی کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”اچھا تو دیکھئے کہ بات کیا ہے۔“

ایلی با غصے میں پہنچا تو بنوائی پر بیویں جھپٹی جیسے چیل کوشت پر جھپٹی ہے۔

”نه جانے۔ وہ بولی۔“ بنو کا کیا ہو گیا ہے۔ وہ آتی روز سے تمہارے دوست کی مالا جپتی ہے کہتی ہے۔ اسے بواو۔“

”ارے۔ ایلی چلایا۔“ کیا واقعی۔“

”نه جانے کیا کر دیا ہے اتنے میری بنو پر۔ بنو کی آواز گلو گیر تھی۔“

”وہ تو عام آدمی تھا جادو مر قونہ تھا۔“

”پتہ نہیں۔ کیا ہوا ہے۔ بے چاری بیمار ہے۔ آپ آئیں نا آج ضرور آئیں ضرور۔“

”آؤں گا۔“ ایلی بولا۔ لیکن حیرت کی وجہ سے اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر کیوں نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر نورانی۔ لا حول ولا قوہ۔“

سکول سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچا۔ دروازے میں ایک خط پڑا تھا۔ اس نے بے خبری میں وہ خط اٹھایا اور بیٹھ کی طرف چلا گیا۔ بیٹھک مقفل تھی۔

”ہوں۔ تو ابھی تک دورے سے نہیں آیا۔ لیکن آخر بات کیا ہے۔ نورانی نے کیا کیا ہو گا۔ شاید ٹوٹا کیا ہو۔ شاید تعریز لے گیا ہو۔ نگاہ میں اتنا اثر نہیں ہو سکتا۔“

اس نے بے خبری میں لفافہ چاک کیا اور خط پڑھے بغیر شلنے لگا۔ سکھیا کا یہ اثر تو نہیں ہو سکتا۔

”نہیں نہیں۔ وہ چلایا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”دفعہ اس کی نگاہ خط پر پڑی۔ صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔“

”میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔ مجھ سے مل جاؤ اللہ کے
واسطے۔ شہزاد۔ اس کی پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

نورانی بنو بنگورا، غلام اور اس کا ستار سب غروب ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک چہرہ طلوع ہو گیا۔ منور چہرہ مانتھے پر پڑا اساتذہ، غمٹا ک آنکھیں اور اس صورت۔ ”میں حارہی ہوں۔“ وہ بولی۔

دلیکن۔ لیکن۔ ایں کو کچھ سمجھنا آرہا تھا۔
گاڑی فرائے بھرتی ہوئی علی پور جا رہی تھی۔

-----**ختم**-----**حصہ چہارم**-----